



متن حدیث میں ہمارے تصرفات*

(۲)

(گزشتہ سے پوسٹہ)

تمہید

میں نے اس مضمون کا عنوان ”متن حدیث میں علما کے تصرفات“ باندھا تھا۔ لفظ ’تصرف‘ کے معنی معاملہ کرنا، اللٹنا پلٹنا، استعمال میں لانا وغیرہ کے آتے ہیں۔ دو روایتیں سے آج تک حدیث کے ساتھ ہم نے جو کچھ کیا ہے، تصرف ہی اس کے بیان کے لیے ایک اچھا لفظ ہے، لیکن بعض لوگوں نے میرا پہلا مضمون پڑھ کر یہ تاثر بیان کیا ہے کہ اس لفظ میں ایک سختی ہے، وہ یہ کہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید علما نے جانتے بوجھتے ایسا کیا ہے۔ لغوی اعتبار سے یہ لفظ نہ منفی ہے اور نہ مثبت۔ ان مضامین میں میرا مقصد علما کی تنقیص نہیں ہے، نہ میں نے اسے اس قسم کے کسی منفی مقصد کے لیے لکھا ہے۔ اس لیے میں نے اس مضمون کا عنوان تبدیل کر دیا ہے، اور عنوان میں سے ’علما‘ کا لفظ نکال دیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون کی پہلی قسط اور اس قسط میں بھی یہی بات عرض کی ہے کہ یہ تصرفات بیان و حکایت کا فطری تقاضا ہیں، راویوں اور علما نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیے۔ ’علما‘ کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا تھا کہ اس میں رواۃ حدیث کے ساتھ ساتھ صوفیہ، محدثین، فقہا، شارحین، مفسرین اور مصنفین سب شامل تھے، ان کے لیے علما ہی کی تعبیر سب سے زیادہ موزوں تھی۔ بہر حال کسی بھی قسم کی غلط فہمی کو زائل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اس کے عنوان میں تبدیلی کر دوں۔ اب یہ مضمون اسی عنوان سے چھپے گا تا آنکہ اس میں کسی قسم کی کوئی خطا سامنے آ جائے۔

* اس مضمون کی پہلی قسط ”متن حدیث میں علما کے تصرفات“ کے زیر عنوان جولائی ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

اس سلسلے کے مضامین کے دو حصے ہیں: ایک تصرفات کے بیان کا اور دوسرا مسئلے کی توجیہ کا۔ واضح رہے کہ یہ دوسرا حصہ میرے ان مضامین کا لازمی حصہ نہیں ہے۔ اس دوسرے حصے، یعنی توجیہ و توضیح کے لیے ان مضامین میں میرا اصول یہ ہے کہ اگر میں مختلف درجے کی احادیث سے اخذ و استفادہ کروں گا، تو اس میں کوئی بھی حدیث حسن یا حسن لغیرہ کے درجے سے نیچے کی نہ ہو، یعنی یہ کہ ان احادیث کو میں اس اصول پر لوں کہ کم از کم صحیح ترا حدیث میں ان مضامین کی تائید اور بنیاد موجود ہو، اور یہ بھی میری کوشش ہوگی کہ اسی حدیث سے استشہاد کروں جسے کسی نہ کسی محدث نے قابلِ احتجاج قرار دیا ہو، میں اپنی رائے پر اس کو منحصر نہیں کروں گا۔ البتہ تصرفات کے بیان میں صحیح و ضعیف کا امتیاز میرے خیال میں ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بھی تصرف ہی کی ایک صورت ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ان ضعیف حدیثوں کو حدیث کی حیثیت نہ بھی دیں، ایک تاریخی و مستویزی حیثیت تو انھیں حاصل ہے ہی، اس لیے تصرف کے تحت تو اسے لایا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ ضعیف روایات کا وجود اور ان کو کتابوں میں لکھنا بذاتِ خود ایک تصرف ہے، یعنی باوجود ضعیف سند کے اسے کسی مجموعہ حدیث میں درج کرنا وغیرہ اقوال رسول پر ایک تصرف ہی تو ہے۔ اسی طرح اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ امت کا ایک بڑا طبقہ ضعیف احادیث سے اخذ و استفادہ کرتا ہے۔ جس مضمون پر ”اشراق“ کے ادارے میں تبصرہ ہوا، اس میں محمد اللہ ایک بھی روایت اس اصول سے ہٹی ہوئی نہیں ہے، جسے میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

اسی طرح بعض احباب نے کہا کہ تمہارا مضمون جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے خاصا مشکل تھا، ان کی آسانی کے لیے میں نے حسب ضرورت مشکل الفاظ کے انگریزی مترادف دے دیے ہیں۔

متن حدیث میں لفظی و معنوی ادراج

تجزئہ حدیث کے بعد اگلا ہم تصرف ادراج ہے۔ ادراج سے ہماری مراد راوی کا عہد یا سہو کلام نبوی میں اپنی بات شامل کرنا ہے۔ اس سے دو قسم کی چیزیں متن حدیث میں شامل ہوئی ہیں: ایک الفاظ، یعنی راوی نے اپنے یا کسی اور راوی کے الفاظ و جمل کو اس طرح سے بیان کر دیا کہ وہ حدیث کے متن کا حصہ قرار پا گئے۔

۱۔ مثلاً امام غزالی جیسے مؤثر ترین عالم کی مشہور کتاب ”احیاء علوم الدین“ ضعیف احادیث سے بھری پڑی ہے، دین و طریقت کے کئی اسباق اس کتاب میں ایسی ہی احادیث سے مستفاد (derived) ہیں، جن کا امت مسلمہ میں عام چلن ہے۔

دوسری راے، اس کی دو صورتیں ہیں،

۱۔ ایک یہ کہ کسی صحابی یا راوی کی راے یا فتویٰ قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر حدیث کی حیثیت پا گیا، قطع نظر اس کے کہ یہ عمل عمدہ ہو یا سہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ احادیث کا معتد بہ حصہ روایت بالمعنی کے طریقے پر منتقل ہوا ہے، اور فقیہ (prudent) سے فقیہ آدمی بھی جب کسی بات کو سمجھ کر دوسروں کو اپنے لفظوں میں سناتا ہے، تو وہ دراصل متکلم کا نہیں، بلکہ اپنا فہم آگے بیان کر رہا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ بھی روایت کا فطری تقاضا ہے، کیونکہ محدثین کی جمع حدیث (compilation) سے پہلے، احادیث بطور ایک مکمل روایت کے کم سنائی جاتی تھیں، بلکہ وہ زیادہ تر اپنی راے یا عمل کے ثبوت کے لیے سنائی جاتی تھیں۔ اس نوعیت کی گفتگو میں الفاظ حدیث کا حسب فہم بدل جانا ایک فطری معاملہ ہے۔ اس میں ضروری نہیں — جیسا کہ بعض خیال کرتے ہیں — کہ راویوں کی نیت فتنہ کی ہو اور اس میں کوئی فساد پیدا کرنا ان کے پیش نظر ہو۔ انسان اپنی فطری وطبعی ضرورتوں کے تحت الفاظ اور کلام کے ساتھ ایسا کرتا ہی کرتا ہے۔ مثلاً بات سمجھاتے وقت اپنی اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اکرم کی بات آپ ہی کے الفاظ میں بیان نہیں کی گئی، بلکہ آپ کے فرمان سے جو سمجھا گیا، اسے اپنے الفاظ میں یا قریب قریب نبی اکرم کے الفاظ ہی میں تھوڑے رد و بدل سے بیان کیا گیا۔ جمہور نے اسے جائز سمجھا ہے:

رأى الجمهور على أن الرواية بالمعنى جائزة وقد دلت ابن رجب على جوازها بأقوال بعض الصحابة والتابعين، وعلماء الحديث المتقدمين، وبأن الله يقص قصص القرون السالفة بغير لغاتها، وقد قيد العلماء هذا الجواز فاشترطوا فيمن يروي الحديث بالمعنى أن يكون عارفاً بمواقع الألفاظ، بصيراً بدلالاتها، حتى لا يحيل الحلال حراماً، أو يضع الدليل في غير مكانه. (شرح علل الترمذی ۱۱۶/۱)

”جمہور کی راے یہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے، اور ابن رجب نے اس کے جواز پر دلائل بھی فراہم کیے ہیں، جن میں اقوال صحابہ و تابعین، متقدم محدثین اور اللہ تعالیٰ کا یہ عمل کہ قدیم اقوام کے قصص کو ان کے غیر زبان میں بیان کیا ہے۔ علما نے اس پر کچھ شرائط عائد کیے ہیں کہ اس طریقے سے روایت کرنے والا الفاظ کے مواقع استعمال سے واقف ہو، ان کی دلائل سے واقف ہو، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حلال کو حرام بنادے یا دلیل کو غلط جگہ رکھ دے۔“

۳۔ وقد روى كثير من الناس الحديث بمعنى فهموه منه، فغيروا المعنى، ”بہتوں نے حدیث کو بالمعنی روایت کیا تو انھوں نے اسے سمجھا اور مفہوم بدل دیا“ (شرح علل الترمذی، ابن رجب ۱۱۶/۱)

۴۔ To narrate or report

طرف سے مثال دے دی یا اپنی بات کو تقویت دینے کے لیے قرآن کی آیت تلاوت کر دی، جس سے سننے والا یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ یہ بھی قولِ نبوی ہی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال مفسرین و مصنفین کے ہاں ملے گی۔ جب وہ کسی مضمون میں قرآن کی آیت سے استشہاد کریں گے تو وہ اپنے مضمون کے موقع محل کی رعایت سے جو ترجمہ کریں گے، وہ اس ترجمے سے مختلف ہوگا، جو انھوں کسی دوسرے مضمون یا اپنی تفسیر میں کیا ہوگا۔ ان تمام مصنفین کی نیت قرآن میں رد و بدل کی نہیں ہوتی، بلکہ موقع محل کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب بدل جاتا ہے۔ چنانچہ یہی امر اس وقت ہوتا تھا، جب صرف مسموع حدیث سے استشہاد کیا جاتا تھا۔ عہدِ اول میں متون حدیث مکتوب (written) حالت میں نہیں تھے کہ جن سے متن کے الفاظ کو جانچا جاسکتا۔ یہ سہولت حدیث کی کتابوں کے وجود میں آنے کے بعد حاصل ہوئی۔ اب یہ کتب اصلاً بالمعنی روایت ہونے والی احادیث پر ہی مشتمل ہیں۔

الفاظ کی تبدیلی، مفہوم کا ابلاغ اور کسی مثال یا آیت سے استشہاد کے عمل سے بلاشبہ ایک راوی کا قول و فہم ہمیں فراہم ہو جاتا ہے، اور ایک قول رسول کے ساتھ مثال یا آیت کی اطلاع بھی ہمیں فراہم ہو جاتی ہے، جو بلاشبہ خود ایک قیمتی چیز ہے۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ جو خرابی پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک امتی کا قول و فہم ارشادِ نبوی نہ ہونے کے باوجود ارشادِ نبوی کی حیثیت پالیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے لیے یہ اتنی سنگین بات نہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت سنگین امر ہے۔ اس امر کی سنگینی کی وجہ یہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف کسی قول کی نسبت کو منع فرمایا تھا، اور اس عمل کی نہایت شدید الفاظ میں مذمت (condemnation) کی تھی، کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ ایسا ہونے سے میری بات کے ساتھ غیر نبی کی بات بھی دین قرار پا جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ صحابہ، ائمہ اور رواۃؓ سمیت تمام امت اس قول کی مخاطب ہے کہ جس نے میری جانب کسی قول کی جھوٹی نسبت کی، اس نے دوزخ میں ٹھکانا بنا لیا۔ کسی کو اس سے استثناء (exception) حاصل نہیں ہے۔ اب فرق صرف یہی ہے کہ اگر کچھ ایسا ہوا

۵۔ To put forth a verse as an evidence

۶۔ جس کی عبارت تحریر میں آکر ابھی محفوظ نہ ہوئی ہو (unwritten)۔

۷۔ To attribute a statement to somebody

۸۔ 'من کذب علی متعمداً، فلیتنبأ مقعده من النار'، جس نے عمداً میرے نام سے جھوٹی بات سنائی، تو وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنا لے' (ابن ماجہ رقم ۳۰)۔

۹۔ Narrators of hadiths

ہے تو سلف صالحین (pious ancestors) نے عمداً ایسا نہیں کیا، اور گناہ گار وہی ہے جس نے عمداً (intentionally) ایسا کیا ہو۔ اسی وجہ سے بعض محدثین روایت بالمعنی کے قائل نہیں تھے، اور بہت سے لوگوں نے اس پر شرائط عائد کیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ روایت بالمعنی روایت تو جائز ہے، مگر اس کے لیے راوی کو زبان و بیان اور حدیث کا صاحب علم ہونا چاہیے۔

اس تصرف کے اثرات

احادیث میں روایات کے بالمعنی منتقل ہونے کی وجہ سے مضامین میں ایسی تبدیلی آ جاتی ہے، جو اس بات کو آفاقی (universally compatible) اور خطا سے پاک نہیں رہنے دیتی، حالاں کہ اللہ اور اس کے رسول نے آفاقی اور بے خطا بات کہی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر نبی خواہ وہ کتنا ہی جید عالم کیوں نہ ہو معصوم عن الخطا نہیں ہے۔

۱۰ علامہ ابن کثیر اپنی کتاب ”اختصار علوم الحدیث“ میں فرماتے ہیں:

وأما روايته الحديث بالمعنى: فإن كان الراوي غير عالم ولا عارف بما يحيل المعنى: فلا خلاف أنه لا تجوز له روايته الحديث بهذه الصفة. وأما إذا كان عالماً بذلك، بصيراً بالألفاظ ومدلولاتها، وبالمتراصف من الألفاظ ونحو ذلك: فقد جاز ذلك جمهور الناس سلفاً وخلفاً وعليه العمل، كما هو المشاهد في الأحاديث الصحاح وغيرها، فإن الواقعة تكون واحدة، وتجيء بألفاظ متعددة، من وجوه مختلفة متباينة. ولما كان هذا قد يوقع في تغيير بعض الأحاديث، منع من الرواية بالمعنى طائفة آخرون من المحدثين والفقهاء الأصوليين، وشددوا في ذلك أكد التشديد. وكان ينبغي أن يكون هذا هو الواقع، ولكن لم يتفق ذلك. (اختصار علوم الحدیث ۱۴۱)

”جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے تو اگر راوی ان باتوں سے واقف و آگاہ نہ ہو، جو معنی میں تغیر کر دیتی ہیں تو اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اس وصف والی، یعنی بالمعنی روایت جائز نہیں ہے۔ اور اگر وہ ان امور سے واقف ہو: الفاظ اور ان کے مدلول کی بصیرت کا حامل ہو، اور الفاظ کے مترادفات وغیرہ سے واقف ہو تو جمہور نے سلف و خلف میں اسے جائز قرار دیا ہے، اور اسی پر عمل ہے، صحیح احادیث میں بھی یہی معاملہ نظر آتا ہے، چنانچہ (ہم دیکھتے ہیں کہ) ایک ہی واقعہ ہوتا ہے، جو مختلف الفاظ اور مختلف رنگ سے بیان ہو رہا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ (روایت بالمعنی) حدیث میں تغیر کا باعث ہوتا ہے، اس لیے بعض محدثین اور اصولی فقہانے روایت بالمعنی کو ممنوع قرار دیا ہے، اور بہت سختی برتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، لیکن اس پر اتفاق نہیں ہو سکا۔“

اس لیے وہ نہ صرف فہم و بیان میں خطا کر سکتا ہے، بلکہ اپنے محدود علم اور اپنے عہد کے سانچوں (paradigms) کے لحاظ سے چیزوں کو دیکھتا ہے۔ جب کہ رسول کا نہ علم محدود ہوتا ہے، اور نہ وہ دین بتاتے وقت زمانی سانچوں کا اسیر ہوتا ہے۔^{۱۲} وہ خالق ارض و سما سے پاتا اور بے کم و کاست اسے بیان کر دیتا ہے۔ اس اکیلے کی بات پوری امت کے تواتر پر بھاری ہوتی ہے، اس لیے کہ اس پر خدا کی ذات براہ راست نگہبان رہتی ہے تاکہ خدا کا پیغام بے کم و کاست اس اسی طرح قرآن مجید اور حدیث کے فہم اور شرح و تفسیر میں بھی قدیم ذہنی سانچہ ایک کردار ادا کرتا رہا ہے۔ قرآن وحدیث کی بہت سی بحثیں اسی قدیم ذہنی سانچے کے تحت تشریح کے بعد آج، اپنی تمام تر علمی عظمت کے باوجود، پوری طرح قابل فہم نہیں رہیں۔ ان کو از سر نو سمجھنا ہے، اللہ اور رسول کی تعلیمات وقت کے دائرے میں بند نہیں ہوتیں، لیکن یہ ہماری تشریحات ہیں جو یہ نقص ان میں پیدا کر دیتی ہیں۔ (مثلاً زمین کا ساکن ہونا وغیرہ قرآن وحدیث میں کہیں بیان نہیں ہوا، مگر ہم اسے قرآن وحدیث ہی کی روشنی میں مانتے رہے ہیں)۔

۱۲ اسلام کی تعلیمات آفاقی، یعنی ہر عہد کے لیے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآن وحدیث کے بہت سے مقامات ایسے بھی ہیں جو عہد نبوی سے متعلق تھے۔ مثلاً قرآن مجید میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چار سے زیادہ شادیوں کی اجازت، سورہ توبہ کی براءت: چار ماہ کی مہلت اور ان کے بعد وادو گیر کا حکم، سورہ توبہ کا عہد برائے مشرکین، سورہ النصر کی فتح و نصرت کی بشارتیں، اور خاص آپ سے مخاطبیت کی آیات وغیرہ عہد نبوی سے کاملاً متعلق ہیں۔ آج کے لیے، مثلاً ہمیں اس کی ضرورت پیغمبر اسلام کی دعوت و انذار کے سمجھنے اور رسالت کے باب میں سنت الہی کے فہم کے لیے تو نہایت ضروری ہے، لیکن اس میں ہمارے لیے کوئی شریعت نہیں ہے۔ مثلاً اب کون ہے جس کو چار سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہو، اور کون ہے، جسے چار ماہ کی مہلت کے بعد وادی وارانگ دی جائے گی، اور یہ حکم کس کے لیے ہے کہ جب فتح مکہ ہو اور لوگ جوق درجوق دائرۃ اسلام میں داخل ہوں تو وہ تسبیح واستغفار کرے وغیرہ۔ ایسی چیزوں کے سوا قرآن کا باقی تمام تر حصہ اپنی تعلیمات کے اعتبار سے ابدی ہے اور ہر زمانے کے اہل ایمان اس کے مکلف ہیں۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو بادشاہ کائنات کا حکم نامہ ہونے کی وجہ سے غیر مسلم بھی اس کے مکلف ہیں۔

ٹھیک ایسا ہی معاملہ احادیث کا ہے۔ اس کے بہت سے متون دور نبوی سے متعلق ہیں، جیسے اُمّرت أن أقاتل الناس حتی يقول لا إله إلا الله، یا جیسے منافقین کی بعض نشانیاں یا جیسے مغازی اور مشرکین عرب کے بارے میں آپ کے بیانات، جیسے صلح حدیبیہ کا معاہدہ اور قریش سے آپ کے مکالمات، بیعت رضوان میں آپ کے کلمات وغیرہ۔ اس طرح کی چیزوں کے سوا بہت سی چیزیں آج کے لیے بھی ہیں، پرانے زمانوں کے لیے بھی تھیں، جیسے خطبہ حجۃ الوداع کی تعلیمات وغیرہ۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول کا انداز بیان اور استدلال اپنے پہلے مخاطبین کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انہی کی زبان میں کلام کرتا ہے وغیرہ۔

کے بندوں تک پہنچ جائے۔^{۱۳} یہ بات محتاج دلیل نہیں ہے کہ انبیاء کے بعد کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہے۔
ادراج متن حدیث میں ہوا، علما نے جس کے پرکھنے کے اصول وغیرہ بنائے ہیں، جو علوم الحدیث کی کتابوں میں
دیکھے جاسکتے ہیں۔^{۱۴} لہذا اب ہمیں دوہری محنت کرنا ہوگی۔ ہر ہر حدیث کے تمام طرق اکٹھے کر کے دیکھنا ہوگا کہ ان
طرق میں ادراج کے کیا کیا امکانات ہیں تاکہ ہم اصل قول رسول تک پہنچ سکیں۔ اگر ہم ان اضافوں سے حدیث
کو میز (distinguish) کر سکیں تو ان شاء اللہ نہ صرف بہت سے امور میں ہم ان اعتراضات سے نکل جائیں
گے، جن کا آج حدیث کو سامنا ہے، بلکہ دین کو بے آمیز صورت بھی سامنے لاسکیں گے۔ آئیے مثالوں سے اسے
سمجھتے ہیں۔

لفظی ادراج کی ایک مثال

عورتوں کو عقل و دین میں ناقص کہنے والی حدیث اس کی ایک سادہ ترین مثال ہے۔ بخاری و مسلم وغیرہ میں
آنے والی حدیث کے الفاظ بالعموم یوں منتقل ہوئے ہیں۔ اضافہ شدہ الفاظ کو خط کشید کر دیا گیا ہے:

عن أبي سعيد الخدري، قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم في أضحى أو فطر إلى المصلى فمر على النساء، فقال: "يا معشر النساء تصدقن فإني أريتكن أكثر أهل النار، فقلن: وبم يا رسول الله؟ قال: "تكثرن اللعن، وتكفرن العشير، ما رأيت من ناقصات عقل ودين أذهب للب الرجل الحازم من إحداكن"، قلن: وما نقصان ديننا وعقلنا يا رسول الله؟ قال: "أليس شهادة المرأة مثل نصف شهادة الرجل"، قلن: بلى، قال: "فذلك	"ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید فطر پڑھانے کے لیے عید گاہ کی طرف نکلے، تو آپ عورتوں کے پڑاؤ سے گزرے، آپ نے فرمایا: اے عورتو، اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو، کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ تم عورتیں زیادہ دوزخ میں جاؤ گی۔ عورتوں نے پوچھا: یا رسول اللہ، ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو، اور شوہر اور عزیزوں کا کفر ان نعمت کرتی ہو۔ میں نے ناقص عقل و دین چیزوں میں سے تم عورتوں سے زیادہ تیز کوئی چیز نہیں دیکھی، جو صاحب حزم مردوں کی عقل ماؤف کر دیتی ہو۔ تو انھوں نے
---	---

نقطہ نظر

من نقصان عقلها، أليس إذا حاضت لم
تصل ولم تصم، قلن: بلى، قال: "فذلك
من نقصان دينها". (بخاری، رقم ۳۰۴)

کہا: اے رسول اللہ، عورت کے اس دین و عقل کے
نقص سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا: کیا عورت کی گواہی
مرد کی گواہی سے آدھی نہیں ہے؟ تو عورتوں نے کہا:
ہاں ایسا ہی ہے، تو آپ نے فرمایا: یہ عورت کی کم عقلی
ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جب وہ حیض سے ہوتی ہے،
تو نہ نماز پڑھ سکتی ہے اور نہ روزے رکھ سکتی ہے؟
عورتوں نے کہا: ہاں، ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: تو
یہ ان کے دین کی کمی ہوئی۔“

حدیث کی اس روایت کے مطابق ’عورتیں دین و عقل میں ناقص ہیں‘ والا جملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان
ہے۔ لیکن دارمی کی سنن اور ابن حبان رحمہما اللہ کی صحیح کے مطابق یہ الفاظ عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ مثلاً
ذیل کی روایت دیکھیے، ہم نے ان مقامات کو خط کھینچ کر نمایاں کر دیا ہے:

عن ابن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال للنساء: "تصلن فإن كن
أكثر أهل النار"، قالت امرأة، لبيبت من
علية النساء: بم، أو لم؟ قال: "إن كن تكثرن
اللعن، وتكفرن العشير".

قال عبد الله: ما من ناقصات العقل
والدين أغلب على الرجال ذوي الأمر
على أمرهم من النساء، قيل: وما نقصان
عقلها ودينها؟ قال: أما نقصان عقلها فإن
شهادة إمرأتين بشهادة رجل، وأما نقصان
دينها فإنه يأتي على إحداهن كذا وكذا من

”عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے گروہ سے
فرمایا: اے عورتو، اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو، کیونکہ تم
عورتیں زیادہ دوزخ میں جاؤ گی۔ ایک کم حیثیت عورت
کھڑی ہوئی اور بولی: یا رسول اللہ، ایسا کیوں ہے؟ آپ
نے فرمایا: اس لیے کہ تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو، اور شوہر
اور عزیزوں کا کفران نعت کرتی ہو۔

حضرت عبد اللہ نے کہا: ناقص عقل و دین چیزوں
میں سے دنیا میں عورتوں سے زیادہ تیز کوئی نہیں ہے،
جو صاحب عقل و راے مردوں پر غلبہ پا کر ان کے
کاموں سے ان کو ہٹا دے۔ تو کہا گیا: عورت کے اس

۱۵ صحیح ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ) کے علاوہ مسند ابی یعلیٰ (متوفی ۳۰۷ھ) اور الإیمان للعدنی (متوفی ۲۴۳ھ)۔ مسند الحمیدی،
رقم ۹۲ میں بھی ان الفاظ کی نسبت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے۔

یوم لا تصلي فيه صلوۃ واحدة۔ دین و عقل کے نقص سے کیا مراد ہے؟ تو حضرت عبداللہ (صحیح ابن حبان، رقم ۳۳۲۳) نے کہا: عقل کے نقص سے مراد یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوتی ہے۔ اور دین کے نقص سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر بعض دن ایسے بھی آتے ہیں جن دنوں میں وہ ایک نماز بھی نہیں پڑھ سکتیں۔“

شاید بعض راویوں نے اوپر کے متن کے ’قال عبد اللہ‘ (حضرت عبداللہ نے کہا) کو حکایت کے عام طریقے پر محض ’قال‘ (کہا) کر دیا ہوگا، جب کہ ان کی نیت میں اس کا فاعل حضرت عبداللہ ہی ہوں گے۔ لیکن سننے والے راوی نے اس ’قال‘ کی ضمیر فاعل کا مرجع (referent) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دے دیا ہوگا، اور اسی فہم کو آگے روایت کر دیا گیا۔ اب حضرت عبداللہ کا یہ جملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا حصہ بن کر قول رسول کا درجہ پا گیا۔ کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بات بھی تو ہو سکتی ہے کہ ابن حبان کی اس روایت میں ’قال عبد اللہ‘ کا اضافہ غلط ہو۔ اس صورت میں بھی معاملہ وہی رہا، کیونکہ اگر پہلی روایت کو اصل مانیں تو دوسری میں تصرف ماننا پڑے گا، اور دوسری کو اصل مانیں تو پہلی میں تصرف ماننا پڑے گا۔ لفظی تصرف تو دونوں صورتوں میں وجود پذیر ہوا ہے۔ ایک میں قول نبوی صحابی کا قول بنا اور دوسرے میں قول صحابی قول نبوی قرار پایا۔

ہمارے پاس اس بات کو ترجیح دینے میں کہ ناقصات عقل والا جملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے، کچھ اور شواہد اور دلائل بھی موجود ہیں۔

۱۔ مسند الحمیدی میں یہ حدیث یوں نقل ہوئی ہے، جس میں عورتوں کے اس سوال کا مخاطب بھی حضرت عبداللہ ہی کو بنایا گیا ہے۔ جس سے مزید واضح ہو جاتا ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم کے نہیں ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے گروہ سے

۱۶ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے، لیکن اس کے راویوں میں وائل بن مہابہ کو بہت سے محدثین نے غیر ثقہ قرار دیا ہے، البتہ حاکم صاحب المستدرک اور ذہبی نے اسے شیخین کے درجے کا راوی قرار دیا ہے، مستدرک حاکم کی روایت رقم ۲۷۷۷، اور ۸۷۸۳۔ پر مستدرک کی تلخیص میں ذہبی نے تعلیق دی ہے کہ ’علی شرط البخاری و مسلم‘۔ حالانکہ ان روایتوں میں بھی وائل بن مہابہ موجود ہے۔

نقطہ نظر

”تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ، وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ فَإِنَّكُنَّ أَكْثَرُ أَهْلِ النَّارِ“، فَقَامَتِ امْرَأَةٌ لَيْسَتْ مِنْ عِلْيَةِ النِّسَاءِ فَقَالَتْ: لِمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: ”لَا تَكُنَّ تُكْثِرَنَّ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرَنَّ الْعَشِيرَ“.

ثُمَّ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ: ”مَا وَجَدَ مِنْ نَاقِصِ الْعَقْلِ وَالْبَدَنِ أَغْلَبَ لِلرِّجَالِ ذَوِي الرَّأْيِ عَلَى أُمُورِهِمْ مِنَ النِّسَاءِ“، قَالَ: فَقِيلَ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ، وَمَا نُقْصَانُ عَقْلِهَا وَدِينُهَا؟ قَالَ: ”أَمَّا نُقْصَانُ عَقْلِهَا فَجَعَلَ اللَّهُ شَهَادَةَ امْرَأَتَيْنِ بِشَهَادَةِ رَجُلٍ، وَأَمَّا نُقْصَانُ دِينِهَا فَإِنَّهَا تَمُكُّ كَذَا يَوْمًا لَا تُصَلِّي لِلَّهِ سَجْدَةً“۔ (مسند الحمیدی، رقم ۹۲)

فرمایا: اے عورتو، اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو، خواہ اپنے زیورات ہی دینا پڑیں، کیونکہ تم عورتیں زیادہ دوزخ میں جاؤ گی۔ ایک کم حیثیت عورت کھڑی ہوئی اور بولی: یا رسول اللہ، ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو، اور شوہر اور عزیزوں کا کفران نعمت کرتی ہو۔

پھر حضرت عبداللہ نے کہا: ناقص عقل و دین چیزوں میں سے دنیا میں عورتوں سے زیادہ تیر کوئی چیز نہیں ہے، جو صاحب عقل و راے مردوں پر غلبہ پا کر ان کے کاموں سے انھیں غافل کر سکتی ہو۔ تو کہا گیا: اے ابو عبد الرحمن: عورت کے اس دین و عقل کے نقص سے کیا مراد ہے؟ تو حضرت عبداللہ نے کہا: عقل کے نقص سے مراد ایک مرد کی گواہی کے برابر دو عورتوں کی گواہی ہے۔ اور عورت کے دین کے نقص سے مراد یہ ہے کہ وہ بعض دنوں میں نماز کا ایک سجدہ بھی نہیں کر سکتی۔“

۲۔ بعض روایات میں قال عبد اللہ کے بجائے صرف قال کے الفاظ رہ گئے ہیں، وہ بھی اس بات کا قرینہ ہیں کہ اب بولنے والا تبدیل ہوا ہے، وگرنہ ایک ہی آدمی کی بات میں دوبارہ قال بلا وجہ نہیں آ سکتا۔ اس قال کو ذیل کی روایت میں خط کشیدہ کر دیا گیا ہے:

۱۔ ابو عبد الرحمن، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔

۱۸۔ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت مسند حمیدی اور مسند الحارث میں آئی ہے، البتہ اسی سند کے ساتھ یہ عبد اللہ کے الفاظ کے بغیر مسند احمد میں بھی آئی ہے۔ اس سلسلہ سند کو ابن حبان، ذہبی اور حاکم صاحب مستدرک نے صحیح قرار دیا ہے۔ مسند احمد، رقم ۳۵۶۹ پر شیخ شعب اللارنوط نے اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ ویسے بھی صحیح ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ) کے علاوہ مسند ابی یعلیٰ (متوفی ۳۰۷ھ) اور الإیمان للعدنی (متوفی ۲۴۳ھ) سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ یہ عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کے الفاظ ہیں، اور وہی ان کے مخاطب بھی بنے۔

نقطہ نظر

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ فَوَعَّظَهُمْ ثُمَّ قَالَ: "يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ، تَصَدَّقْنَ فَإِنَّكُمْ أَكْثَرُ أَهْلِ النَّارِ"، فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ: وَلِمَ ذَاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: "لِكثْرَةِ لَعْنِكُنَّ، يَعْنِي وَكَفْرِكُمْ بِالْعَشِيرِ". قَالَ: "وَمَا رَأَيْتُ مِنْ نَافِصَاتٍ عَقْلٍ وَدِينٍ أَغْلَبَ لِلنَّوِي الْأَلْبَابِ، وَذَوِي الرَّأْيِ مِنْكُمْ"، قَالَتِ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ: وَمَا نُقْصَانُ دِينِهَا وَعَقْلُهَا؟ قَالَ: "شَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ مِنْكُمْ بِشَهَادَةِ رَجُلٍ، وَنُقْصَانُ دِينِكُنَّ، الْحَيْضَةُ، تَمُكُّتُ أَحَدَاكُنَّ الثَّلَاثَ وَالْأَرْبَعَ لَا تُصَلِّيَ". (سنن الترمذی، رقم ۲۶۱۳)

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا، انھیں نصیحتیں کیں، پھر فرمایا: اے عورتو، تم اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو، کیونکہ تم دوزخ میں زیادہ جاؤ گی۔ عورتوں میں سے ایک بولی: ایسا کیوں ہے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: تمھاری لعن طعن کی کثرت کی وجہ سے، یعنی شوہر اور اعزہ کی ناشکری کی وجہ سے۔ فرمایا: میں نے ناقص عقل و دین چیزوں میں سے تم سے زیادہ صاحب رائے و دانش مردوں کی عقل پر چھانے والی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا: دین اور عقل کے نقص سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا: یہ کہ دو عورتیں گواہی میں ایک مرد کے برابر ہیں، (یہ عقل کی کمی ہوئی) اور دین کی کمی یہ ہے کہ حیض تم سب کو کم از کم تین چار دنوں تک نماز سے روکے رکھتا ہے۔“

چنانچہ پہلے اور دوسرے نکتے کو ملا کر بات بہت مضبوط ہو جاتی ہے کہ یہ اضافہ دراصل ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات ہے، جسے بعد کے راویوں نے غلط طور پر نبی اکرم سے منسوب کر دیا تھا۔

۳۔ بہت سی کتب میں یہ روایت بہت مختصر ہے۔ یعنی انھوں نے عبد اللہ بن مسعود کے کلام والا حصہ نقل نہیں کیا ہے۔ یہ بھی ایک تائیدی اشارہ ہے کہ یہ جملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے، بلکہ عبد اللہ ابن مسعود کا ہے، جو اصل روایت کا حصہ ہی نہیں تھا۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دلیل نہیں ہے، لیکن اوپر کی صریح روایات کے بعد یہ بلاشبہ ایک قوی قرینہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب کہ تم خاوند کی ناشکری کرتی ہو، کے بعد مزید سوالات بھی نہیں کیے گئے، بس عورتوں نے خیرات میں زیورات دینے شروع کر دیے:

۱۹۔ الالبانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے: صحیح، الإرواء (۲۰۵/۱)، الظلال (۹۵۶)۔ اس طرح کی روایت ابن مندہ کی الإیمان رقم ۶۶۷ میں بھی آئی ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلَاةَ يَوْمَ الْعِيدِ، فَبَدَأَ بِالصَّلَاةِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ، بَغَيْرِ أَذَانٍ وَلَا إِقَامَةٍ، ثُمَّ قَامَ مُتَوَكِّئًا عَلَى بِلَالٍ، فَأَمَرَ بِتَقْوَى اللَّهِ، وَحَثَّ عَلَى طَاعَتِهِ، وَوَعَظَ النَّاسَ وَذَكَرَهُمْ، ثُمَّ مَضَى حَتَّى أَتَى النِّسَاءَ، فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَرَهُنَّ، فَقَالَ: "تَصَدَّقْنَ، فَإِنَّ أَكْثَرَ كُنَّ حَطَبُ جَهَنَّمَ"، فَقَامَتِ امْرَأَةٌ مِنْ سِبْطَةِ النِّسَاءِ سَفْعَاءُ الْخَدَّيْنِ، فَقَالَتْ: لِمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: "لَأَنْكُنَّ تُكْبِرُنَ الشَّكَاةَ، وَتَكْفُرُنَ الْعَشِيرَ"، قَالَ: فَجَعَلَنَ يَتَصَدَّقَنَّ مِنْ حُلِيِّهِنَّ، يُلْقِينَ فِي ثَوْبِ بِلَالٍ مِنْ أَقْرِطَتِهِنَّ وَخَوَاتِمِهِنَّ" (مسلم، رقم ۸۸۵)

”جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک عید پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، آپ نے نماز خطبے سے پہلے پڑھائی، جس کے لیے نہ اذان دی گئی اور نہ اقامت کہی گئی۔ پھر آپ بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے، آپ نے اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا، اللہ کی اطاعت پر ابھارا، لوگوں کو نصیحت کی، اچھی باتوں کی یاد دہانی کی، پھر آپ وہاں سے چل دیے اور عورتوں کی جگہ پر آئے، آپ نے انھیں بھی وعظ و نصیحت کی، اور فرمایا: اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو، کیونکہ تم میں سے اکثر دوزخ کا ایندھن بننے والی ہو۔ ایک سیاہ گالوں والی غریب عورت کی کھڑی ہوئی اور بولی: کیوں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ تم شکایات بہت کرتی ہو، اور شوہروں اور اعزہ کی ناشکری کرتی ہو۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ پھر عورتیں اپنے زیورات راہِ خدا میں دینے لگیں اور وہ حضرت بلال کی چادر میں اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں ڈالنے لگیں۔“

۲- میرے ایک سرسری استقصا سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ۲۳۵ ہجری سے پہلے وفات پانے والے محدثین کی کتب میں ان روایات میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بعد میں کہیں اضافہ ہوئے ہیں۔ مثلاً ابوداؤد طیالسی (متوفی ۲۰۴ھ) کی مسند، حمیدی (متوفی ۲۱۹ھ) کی مسند، ابن الجعد (متوفی ۲۳۰ھ) کی مسند، ابن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) کی مصنف، وغیرہ میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔ لگتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ آہستہ

۲۰ ابوداؤد سلیمان بن داؤد بن الجارود طیالسی بصری۔

۲۱ ابوبکر عبد اللہ بن الزبیر بن عیسیٰ بن عبید اللہ قرشی حمیدی کی۔

۲۲ علی بن الجعد بن عبید بن ہری بغدادی۔

۲۳ ابوبکر بن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان بن خواستی عیسیٰ۔

آہستہ نبی اکرم سے نسبت پا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے سب سے پہلے یہ الفاظ سلمیٰ (متوفی ۲۳۸ھ) کی کتاب ”ادب النساء“ میں ملتے ہیں:

وأنه صلى الله عليه وسلم قال: ”أكثر من الصدقة! فإنك أكثر أهل النار!“ فقالت إحداهن: ولم يا رسول الله؟ قال: ”إنك أنكر الناس لنعمته! وإنني لم أر ناقصات عقل ودين وأصرف لقلوب الرجال ذوي الأحلام منكن!“ (۲۷۳)

۵۔ صحیح بخاری کی جو روایت (رقم ۳۰۴) ہم نے اوپر بیان کی ہے، اس سے اور اس سے مماثل روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عورتوں سے الگ سے بات کی، تو یقیناً وہاں سوائے حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور خواتین کے آپ کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ لیکن سنن ترمذی کی محولہ بالا اس حدیث (رقم ۲۶۱۳) اور دیگر مرد صحابہ سے مروی روایات میں یہ تاثر ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں سے اکٹھے خطاب کیا گیا۔ اس حدیث کو روایت کرنے والے تینوں مرد صحابہ اسے نبی اکرم سے براہ راست بیان کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے بخاری والی بات ماننے میں تردد پیش آتا ہے، اس لیے کہ اس روایت کو کسی نے حضرت بلال سے یا اپنی ازواج سے روایت نہیں کیا، بلکہ تینوں صحابہ نے براہ راست نبی اکرم سے بیان کیا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی ایک تصرف ہو، اور بخاری کی بات ہی درست ہو۔ اگر بخاری کی بات درست ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یاسیدنا بلال سے یا خواتین سے یہ روایت ہم تک پہنچی ہوگی۔ دوسری صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ ابوسعید خدری، جابر بن عبد اللہ، ابو ہریرہ، اور عبد اللہ ابن مسعود بھی خواتین کے پنڈال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ لگتا یہ ہے کہ یہ روایت اصلاً خانوادہ (family) ابن مسعود سے ہم تک پہنچی ہے۔ ان کی اہلیہ رضی اللہ عنہا، اس مجلس میں موجود تھیں (بخاری، رقم ۱۳۶۶)، انھوں نے اپنے زیور کا صدقہ کرنا چاہا تھا۔ جس میں پھر وہ سوال

۲۴ ابومروان عبد الملک بن حبیب بن حبیب بن سلیمان بن ہارون سلمی قرطبی۔

۲۵ مکمل حدیث یوں ہے: عَنْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِ اللَّهِ - بِمَثَلِهِ سَوَاءً - قَالَتْ: كُنْتُ فِي الْمَسْجِدِ، فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ”تَصَدَّقْنَ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ“ وَكَانَتْ زَيْنَبُ تُنْفِقُ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ، وَأَيْتَامَ فِي حَجَرِهَا، قَالَ: فَقَالَتْ لِعَبْدِ اللَّهِ: سَلْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيْحِزِّي عَنِّي أَنْ أَنْفِقَ عَلَيْكَ وَعَلَى أَيْتَامَ فِي حَجَرِي مِنَ الصَّدَقَةِ؟ فَقَالَ: سَلِي أَنْتِ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَنْطَلَقْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَوَجَدْتُ امْرَأَةً مِنَ الْأَنْصَارِ عَلَى الْبَابِ، حَاجَتُهَا مِثْلُ حَاجَتِي، فَمَرَّ عَلَيْنَا بِالْأَلِّ، فَقُلْنَا: سَلِ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيْحِزِّي عَنِّي أَنْ أَنْفِقَ عَلَى زَوْجِي، وَأَيْتَامَ لِي فِي حَجَرِي؟ وَقُلْنَا: لَا تُخْبِرُ بِنَا، فَدَخَلَ فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: مَنْ هُمَا؟ قَالَ: زَيْنَبُ، قَالَ: ”أَيُّ الزَّيَانِبِ؟“ قَالَ:

اٹھا تھا کہ آیا وہ اپنے میاں اور یتیم بھتیجے جو انھوں نے پالنے کے لیے گود لیے ہیں، کیا ان پر خرچ کر سکتی ہیں؟ میرے استقصا کی حد تک حضرت زینب، یعنی زوجہ عبداللہ ابن مسعود نے ناقصات عقل والا جملہ نقل ہی نہیں کیا، جو براہ راست اس واقعہ کی شاہد تھیں۔ صحیح بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ و خیرات پر ابھارنے کی یہ بات حضرت زینب ہی کو دیکھ کر شروع کی تھی، کیونکہ آپ صاحب ثروت خاتون تھیں۔ اس لیے اگر وہ ناقصات عقل والی بات کسی روایت میں نہیں بتاتیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بات نبی پاک نے کی ہی نہیں۔

۶۔ ناقصات عقل و دین کی توضیح والا جملہ سیاق و سباق سے میل نہیں کھاتا۔ جب عورت کی تخلیق ہی اس طرح سے ہوئی ہے کہ وہ عقل میں ناقص ہے۔ وہ اس پیدائشی نقص کے سبب سے مرد کی عقل پر اثر انداز ہوتی ہے تو اس کا تو قصور ہی نہ ہوا، اس لیے کہ اس کا یہ پیدائشی نقص اس کے لیے عذر ہے۔ اسے ایک چیز کی سمجھ ہی نہیں ہے، تو وہ مجرم کس طرح سے ہوئی۔ جرم تو تب تھا کہ وہ مکمل عقل و شعور کی مالک ہونے کے بعد ایسا کرتی۔ اس لیے دوزخ میں عورتوں کے زیادہ ہونے کی وجہ ناقابل فہم ہے۔

یہ بات دین کے مسلمہ اصولوں اور قرآن و سنت کے قطعی نصوص (verses) کے بھی خلاف ہے کہ مکلف کم عقل ہو، پھر بھی اسے سزا ملے۔ سب سے بڑا جرم جس پر ایک عورت مرد کو ابھار سکتی ہے، وہ زنا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے عورتوں کو جرم بھی کیا ہے؟ قرآن مجید نے بھی ایک ہی سانس میں دونوں کو برابر قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ دونوں کے بارے میں کوئی نرمی اللہ کے دین میں نہیں ہے: **الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ (النور ۲۴:۲)**۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت جب وہ کسی مرد کی عقل

امْرَأَةً عَبْدُ اللَّهِ، قَالَ: ”نَعَمْ، لَهَا أَجْرَانِ، أَجْرُ الْقَرَابَةِ وَأَجْرُ الصَّدَقَةِ“۔

۲۶ مثلاً لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا (البقرہ ۲:۲۸۶)، اور رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنْ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبُرَ، وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ أَوْ يَفِيْقَ (سنن ابن ماجہ، رقم ۲۰۴۱) جیسے اصول یہ بتاتے ہیں کہ انسان کو اس کی عقل و ہمت اور قوت کے لحاظ سے مکلف بنایا گیا ہے، اور تین لوگوں پر شریعت کی کوئی گرفت نہیں، جن میں بچے، سوائے شخص اور مجنون کو شامل کیا گیا ہے، یہ وہ تینوں حالتیں ہیں جب آدمی عقل و شعور سے عاری ہوتا ہے۔ یہ شان دار اصول دینے والا دین ”بے عقل عورتوں“ کو حدود و تعزیرات میں عقل کے نقص کے باوجود برابر کی سزا دے، اور مزید ظلم یہ ہو کہ دوزخ میں اس قدرتی نقص جو اللہ نے ان میں رکھا ہے جس میں ان کا کوئی اختیار نہیں — کی وجہ سے زیادہ ڈالی جائیں۔

پر حاوی ہوتی ہیں، تو ناقص عقل ہیں، لیکن جب سزا کا موقع آئے تو انھیں وہی سزا ملے، جو کامل عقل والے کو ملتی ہے!! اس کا کوئی اثر سزائیں ظاہر نہ ہو، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن کے اس بیان اور عورت کو رجم کرنے کے عمل نبوی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کو عقل میں برابر مانا ہے، اگر عقل و دانش میں کم مانا ہوتا تو اسلام عورت کے ساتھ مختلف معاملہ کرتا، کیونکہ اس حدیث کے مطابق وہ عقل کی کمی کی وجہ سے معذور تھی۔

واضح رہے کہ غلام عورت کو زنا کی آدھی سزا دی گئی ہے، اس لیے کہ معاشرے میں اس کے مقام کی وجہ سے اسے اس درجہ کا احسان^{۲۸} و تحفظ حاصل نہیں تھا جو آزاد عورت کو حاصل تھا۔ لہذا اس کی سزا تو کم ہو گئی، لیکن ایک عورت جو خدا کی طرف سے تھی ہی ناقص عقل، اسے بعض چیزیں سمجھ ہی نہیں آ سکتیں تو اس کی سزا کم کیوں نہ ہوئی؟ حد یہ ہے کہ تمام جرائم میں عورت کو مرد کے برابر سزا دی گئی ہے۔ مثلاً چوری کی سزا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فاطمہ نامی عورت کے ہاتھ بھی کاٹے ہیں۔ کیوں یہ بات اس وقت پیش نظر نہ رہی کہ وہ ناقص عقل ہے!

دین کے تمام احکام سے ثابت ہے کہ عورت مرد ہی کی طرح دین کی پوری پوری مکلف ہے۔ مثلاً دونوں ارتکاب شرک پر دوزخ میں جائیں گے، اگر عورت کم عقل ہے تو اسے تو سمجھ ہی نہیں آئے گی کہ شرک کیا ہے اور کیا نہیں ہے، پھر سزا کس بات کی؟ وغیرہ۔ لہذا حدیث کے متن پر یہ اضافہ دین کی باقی تمام تعلیمات کی نفی کرتا ہے۔ جن کا مدار قطعی نصوص پر ہے۔ لہذا درست بات یہ ہے کہ ان کے زیادہ دوزخ میں جانے کا سبب یہی ہونا چاہیے کہ ان کو عقل و شعور تو پورا پورا ہے، لیکن اس کے ہوتے ہوئے وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ گناہ کرتی ہیں اور ان کی عقل پر حاوی ہو کر ان کو گناہوں پر ابھارتی ہیں۔

۶۔ جس نقص دین و عقل کی بات اس روایت میں کی گئی ہے، وہ نقص کہلانے کا موجب نہیں ہے۔ حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھنا اور گواہی کا آدھا ہونا، کسی طرح نقص بمعنی خطا نہیں ہے۔ خود صانع فطرت نے جس چیز کو جیسا تخلیق

۲۷ Protection and inaccessibility، آزاد و غلام کے اس فرق کی وجہ غالباً یہ تھی کہ خاندانی ہونے یا معاشرے میں خاوند، والد، چچا تایا کی موجودگی کی وجہ سے آزاد عورت کو معاشرے میں عزت کا مقام حاصل تھا، آزاد عورت کے ساتھ ان سب لوگوں کی غیرت وابستہ ہوتی تھی، یہ غیرت جسے عرب 'حفیظہ' کہتے تھے عورت کے تحفظ کی ضامن تھی، جب کہ لونڈیوں کے لیے ایسا نہیں تھا، نہ معاشرے میں ان کا آزاد عزیز موجود ہوتا نہ ان کے ساتھ کسی کی غیرت وابستہ ہوتی، اور نہ ان کو اس ضمن میں تحفظ حاصل ہوتا۔ لہذا وہ معاشرے سے حاصل حصانت کے بل پر کسی کو دست درازی سے روک نہ پاتی تھیں۔ اسلام نے یہ تحفظ بعد میں ان غلام عورتوں کو بھی حکومت اور قانون سازی کے ذریعے سے فراہم کیا۔

۲۸ واضح رہے کہ استاذ گرامی کے نزدیک عورت کی گواہی کی صورت وہ نہیں ہے، جو بالعموم مانی جاتی ہے۔ تفصیل کے لیے

کیا ہو، وہ نہ نقص ہے اور نہ دوش دیے جانے کا سبب۔

خود شریعت یا صانع فطرت نے جس چیز کو مقرر یا تخلیق کیا ہو، وہ نقص موجب سزا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک گونگے آدمی کو اس بات پر کافر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تصدیق باللسان نہیں کر سکتا۔ عورتوں کے لیے دین ہی یہ ہے کہ وہ ان دنوں میں نماز نہ پڑھیں۔ ان کا ایسا کرنا ہی کامل اطاعت الہی ہے۔ وہ عورت تو ناقص دین ہے، جو طہر کے دنوں میں نماز نہ پڑھے۔ لیکن وہ عورت ناقص دین کیسے ہو سکتی ہے، جو خدا کے حکم ہی کی وجہ سے چند مخصوص دنوں میں نماز نہ پڑھے۔ لہذا یہ تبصرہ بھی بر محل نہیں ہے۔ عقل و دین میں ناقص ہونا، رعایت کی وجہ تو ہو سکتا ہے، دوزخی ہونے کی وجہ نہیں ہو سکتا۔

۷۔ اسی طرح جن نقائص کا ذکر ہوا ہے، وہ کسی کی عقل کی کمی پر کیسے دلالت کرتا ہے؟ کیا حیض میں نماز نہ پڑھنے سے عقل متاثر ہوتی ہے یا گواہی آدھی ہونے سے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کی گواہی کو دو آدمیوں کے برابر قرار دیا تھا، تو کیا (استغفر اللہ، صرف بات سمجھانے کے لیے عرض کر رہا ہوں) باقی تمام صحابہ ابو بکر و عمر، بلکہ خلفائے راشدہ سمیت سب صحابہ نعوذ باللہ ان کے مقابلے میں ناقص العقل تھے؟ ابو بکر کی صدیقیت، عمر کی فاروقیت، عثمان کی حیا علی کی قضا، ابن مسعود کی قرآنیت، عبیدہ بن الجراح کی امانۃ الامۃ، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ — وغیرہ ان دو گواہیوں والے ایک صحابی کے مقابلے میں کیا ٹھہریں گے! گواہی کے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی تعلق عقل و بصیرت سے نہیں ہے۔ ساری امت جانتی ہے کہ ان دو گواہیوں والے صحابی حضرت خزیمہ کے مقابلے میں خلفائے راشدہ — رضوان اللہ علیہم اجمعین — کا مقام و مرتبہ زیادہ ہے، حالانکہ ان سب کی گواہی خزیمہ کے مقابلے میں آدھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی گواہی کی بنیاد عقل کی کمی بیشی پر نہیں رکھی، بلکہ عدالت اور بھول چوک (خطا وغیرہ) سے مبرا ہونے پر رکھی ہے تاکہ گواہی میں شبہات نہ رہیں۔ یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ مرد و عورت

استاذ گرامی کی میزان: قانون معیشت / تحریر و شہادت، دیکھی جاسکتی ہے۔

۲۹ 'خُزَيْمَةُ فَهُوَ بِنِ ثَابِتٍ ذُو الشَّهَادَتَيْنِ' "خزیمہ جو ثابث کے بیٹے ہیں، جن کی گواہی دو کے برابر ہے" (فتح الباری ۱۵/۹)۔

۳۰ 'وَأَشْهَدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ' "اور اپنے لوگوں میں سے دو عادل لوگوں کو گواہ بناؤ" (الطلاق ۶۵:۲)۔ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ دو زیادہ سیانے لوگوں کو گواہ بناؤ۔

۳۱ اسی مقصد کے لیے دو اور چار کی تعداد مقرر کی، ورنہ ایک مرد بھی کافی ہو سکتا تھا۔ عورتوں کے باب میں بھی دو کا مطالبہ اسی اصول پر ہوا ہے، یعنی شبہ زائل ہو۔ ارشاد ہے:

برابر ہیں۔

۸۔ عورت کا مرد کی عقل کو فتور میں مبتلا کر کے اس کو غلط کام پر اکسانا بلاشبہ ایک گناہ کی چیز ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کوئی عورت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ مرد بھی عورت اور دیگر انسانوں کو اکساتا ہے۔ رہا وہ پہلو جس کو ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ مرد جب عورت کے جال میں پھنس کر وہ بات کہہ یا کر دیتا ہے جس پر اس نے ابھارا ہوتا ہے تو گویا وہ صرف ابھارنے کی مجرم نہیں ہے، بلکہ اس کا شریک بھی ہے۔ اس لیے وہ زیادہ قصور وار ہوئی۔^{۳۲} یہ بات بھی تب درست ہے کہ مرد دوسروں کو برائی پر نہ اکساتے ہوں، اور اکسا کر ہمیشہ پیچھے ہٹ جاتے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت کے لیے مرد وہی کردار ادا کرتا ہے، جو اس روایت میں عورت کے لیے بیان ہوا ہے۔

روایت کا اپنا جملہ تو یہی بات کہتا ہے کہ تمہیں عقل تو پوری ملی ہے، مگر پھر بھی تم مردوں کے مقابلے میں لعن طعن اور کفران زوج کرتی ہو، حالاں کہ اس سے بچنے کی عقل اور صلاحیت تمہیں ویسی ہی دی گئی ہے، جیسی مردوں کو، اسی لیے تو تم زیادہ دوزخ میں جاؤ گی۔ جب کہ اس پر اس متضاد جملے کو عطف کر دیا گیا ہے کہ تم ناقص عقل ہو۔ اس دراز گوئی کا مقصد یہ ہے کہ کئی پہلوؤں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ پیغمبر اسلام کا جملہ نہیں ہے۔ ایک صحابی کا فرمان ہے، ان کی بات بھی بلاشبہ ایک نوع کی چیت اپنے اندر رکھتی ہے، لیکن بہر حال وہ قول رسول کے برابر نہیں ہے۔

اصل بات کیا ہوگی

اوپر کی بحث سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ ناقصات عقل والا جملہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تھا، جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دیا گیا۔

یہ بات اگرچہ میرے اس مضمون کے دائرے میں نہیں آتی، لیکن اپنی جگہ اہم ہے کہ حدیث میں جن دو جرموں کا

وَأَمْرَاتٍ مِّمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ. (البقرہ ۲۸۲)

”اور دو عورتیں، جن کو تم گواہی کے لیے پسند کرو تا کہ ایک گڑبڑ اجائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔“

اسی مقصد کے لیے تحریر لکھنے کا حکم دیا کیونکہ: وَقُومُوا لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا، ”وہ گواہی کو زیادہ صحیح رکھنے والی اور شکوک و شبہات سے زیادہ بچانے والی ہے۔“ ظاہر ہے تحریر کے سیانہ اور عقل مند ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔

۳۲ وَيُظْهِرُ لِي أَنَّ ذَلِكَ مِنْ جُمْلَةِ أَسْبَابِ كَوْنِهِنَّ أَكْثَرُ أَهْلِ النَّارِ؛ لِأَنَّهُنَّ إِذَا كُنَّ سَبَبًا لِإِذْهَابِ عَقْلِ الرَّجُلِ الْحَازِمِ حَتَّى يَفْعَلَ أَوْ يَقُولَ مَا لَا يَنْبَغِي، فَقَدْ شَارَكْنَهُ فِي الْإِثْمِ وَزِدْنَ عَلَيْهِ. (فتح الباری ۶/۱۱۷)

ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں کہ وہ شوہروں اور اعزہ کی ناشکری ہیں، اور لعن طعن زیادہ کرتی ہیں، وہ بظاہر دوزخ میں لے جانے والا جرم محسوس نہیں ہوتا، اس لیے شاید عبداللہ بن مسعود نے عورتوں کے بہ کثرت دوزخ میں جانے کی ایک اور ایسی وجہ بتانے کی کوشش کی جو دوزخ میں لے جانے کا جواز مضبوط کرتی ہو۔ لیکن تمام طرق بلا امتیاز سدا کٹھے کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف احادیث میں جرم کی نوعیت مختلف ہے۔

ان جرائم کی فہرست اگر بنائی جائے تو وہ درج ذیل بنیں گے:

۱۔ احمران: سونا اور زعفران^{۳۳} کی بنا پر آخرت سے غفلت^{۳۴}، یعنی مسلسل زیباہش تن میں مشغول رہنا کہ آخرت فراموش ہی ہو کر رہ جائے (ادب النساء، رقم ۲۲۰)۔

۲۔ شوہر کی احسان فراموشی اور کثرت شکایت، اور مطلق احسان فراموشی (بخاری، رقم ۱۰۵۲، متعدد۔ کثرت شکایت کا مضمون سنن داری، رقم ۱۶۵۱)۔

۳۔ لعن طعن کرنا اور دوسری عورتوں میں اس عادت کو پھیلانا (سنن الداری، رقم ۱۶۵۱)۔

سوائے پہلے جرم کے ان میں سے ہر جرم الگ الگ بہ کثرت دوزخ میں جانے کا سبب بنتا ہے یا نہیں۔ بحیثیت فرمان پیغمبر ہمیں ماننے میں تردد نہیں ہے، لیکن ایک ایسا جرم جس کی سزا میں ایک گروہ انسانیت بہ کثرت دوزخی ہونے

۳۳۔ زعفران ایک پودا ہے، جس کے پھول کورنگ اور خوشبو کے لیے پیس کر سفوف (پاؤڈر) بنالیا جاتا تھا۔ اسے بطور خوشبو بھی استعمال کیا جاتا تھا، اور اس سے داڑھی اور سر کے بالوں اور کپڑوں کو رنگنے اور چاندی کے زیورات پر زرد رنگ چڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گویا یہ زیب و زینت کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کی طلب، حصول اور استعمال کی تراکیب وغیرہ عورتوں کے لیے مشغولیت کا بڑا سبب رہا ہوگا۔

۳۴۔ واضح رہے کہ آخرت سے غفلت ہی بلاشبہ وہ چیز ہے جو مرد و عورت ہر ایک کو دوزخ میں لے جائے گی۔ خود قرآن مجید نے اسی مضمون کو سورۃ النکاثر میں اور دیگر بے شمار جگہوں پر بیان کیا ہے۔ سورۃ النکاثر میں تو الفاظ بھی وہی ہیں، جو اس حدیث میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اَلْهٰکُمْ التَّکَاثُرُ۔ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ، ’’تمہیں مال کی کثرت کے جذبے نے تمام عمر غافل رکھا، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے‘‘ (۱۰۲:۱-۲)۔ یہ وہ وجہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہوگی۔ عورتوں کو بننے سنور نے اور سونا چاندی کے پیچھے لگے رہنے سے وہ غفلت پیدا ہوئی جس نے جنت کی تیاریوں سے روک رکھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک کچھ اسی مفہوم کا ہے، جیسے ہم پنجاب کے محاورے کے مطابق کہیں: انھیں سرخی پوڈر نے غافل کیے رکھا۔ یعنی بناؤ سنگھار نے۔ اس طرح کے جملے سے اس چیز کی حرمت بیان نہیں ہوتی، بلکہ یہ بیان ہوتا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس میں مشغول ہو کر آدمی اپنی راہ کھوٹی کر سکتا ہے۔

والا ہو، تو اس کو محض ایک روایت میں بیان کیا جائے، کہیں اور زیر بحث نہ آئے، یہ ایک حیرت کی بات ہے؛ نہ قرآن میں، نہ اور دیگر احادیث میں۔ لہذا تاویل کرنا ہوگی۔ حضرت عبداللہ نے یہی کوشش کی تھی۔ جواب ہمارے سامنے قول رسول کا حصہ بن کر روایت ہوئی ہے۔ لیکن یہ تاویل اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ دین کے محکم اصولوں اور تعلیمات کے برعکس ہے۔

اگر زینب زوجہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی روایت تک بات کو محدود رکھا جائے، جو اس گفتگو کے وقت خواتین کے پنڈال میں تھیں تو نہ ناقصات عقل و دین والی بات حدیث نبوی کا حصہ بنتی ہے، اور نہ شوہر کی ناشکری اور لعن طعن والی بات۔ حضرت زینب نے ان دونوں باتوں کا ذکر اپنی کسی روایت میں نہیں کیا۔ جو بذات خود ایک اہم بات ہے۔

لفظی ادراج کی ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں، اس لیے کہ مضمون پہلے ہی بہت طویل ہو گیا ہے۔

معنوی ادراج

پہلی مثال تو حدیث میں ایک جملے کے درج ہونے کی ہے، یہ دوسری مثال اس بات کی ہے کہ بالمعنی روایت ہونے سے معنوی ادراج بھی ہوتا ہے۔ جس کی یہاں میں وہ مثال دوں گا جس کی غلطی خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے نکال دی تھی۔ آئیے اب ایسی ہی ایک مثال دیکھتے ہیں، جس میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے تبدیلی کی، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کی۔ یہ تبدیلی ایسی ہے کہ شاید ہی کسی عالم دین کی گرفت میں آ سکتی:

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "إِذَا أَتَيْتَ مَضْجَعَكَ، فَتَوَضَّأْ وَضُوءَكَ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلَى شِقِّكَ الْيُمَنِ، ثُمَّ قُلْ: اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ" "براء بن عازب کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سونے کے لیے بستر پر آؤ تو نماز والا وضو کرو، پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ، پھر یہ دعا کیا کرو: اے اللہ، میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرتا

۳۵ اگرچہ یہاں چہرہ کا لفظ آیا ہے، لیکن عربی محاورے کے مطابق چہرہ بول کر پوری ذات مراد ہوتی ہے۔ میں نے ترجمہ

اسی لحاظ سے کیا ہے، اس کی مثالیں قرآن مجید میں بھی ہیں، جیسے کہ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ میں استعمال ہوا ہے:

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ.

”اور اللہ کے ساتھ کسی اور الہ کو مت پکارو، اس لیے کہ اس کے سوا کوئی الہ ہی نہیں ہے، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے،

سوائے اس کی ذات (چہرے) کے، اسی کی حاکمیت ہے، اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

وَجْهِي إِلَيْكَ، وَفَوَضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ،
وَالْحَاجَاتُ ظَهَرِي إِلَيْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً
إِلَيْكَ، لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ،
اللَّهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ، وَبِنَبِيِّكَ
الَّذِي أُرْسِلْتُ. فَإِنْ مِتُّ مِنْ لَيْلَتِكَ، فَأَنْتَ
عَلَى الْفُطْرَةِ، وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَتَكَلَّمُ بِهِ“.
قَالَ: فَرَدَّدْتُهَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،
فَلَمَّا بَلَغْتُ: اللَّهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي
أَنْزَلْتَ، قُلْتُ: وَرَسُولُكَ، قَالَ: ”لَا، وَنَبِيِّكَ
الَّذِي أُرْسِلْتُ“۔ (بخاری، رقم ۲۴۷)

ہوں۔ اپنا معاملہ آپ کو تفویض کرتا ہوں، آپ کی
پشت پناہی میں آتا ہوں، آپ کے ساتھ تعلق خاطر
اور آپ کی رعب و ہیبت کی وجہ سے، اور اس وجہ سے
کہ آپ کے سوا میرا نہ کوئی ملجا ہے اور نہ کوئی پناہ۔
اے اللہ، میں نے آپ کی کتاب قرآن مجید کو مان لیا
ہے، اور آپ کے نبی کو بھی مان لیا ہے، جنہیں آپ نے
رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دعا سکھا کر آپ نے فرمایا: اگر
تو اس رات کو مر گیا، تو تو فطرتِ سلیم پر فوت ہوگا، ان
الفاظ کو اپنے آخری کلمات بنا لو، جو تم سوتے وقت
کہو گے۔ تو کہتے ہیں کہ میں نے یہ دعا نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کو (یہ دیکھنے کے لیے کہ مجھے صحیح یاد ہوگئی
ہے) سنائی تو جب میں یہاں پہنچا کہ اے اللہ، میں
نے آپ کی کتاب کو مان لیا ہے، اور آپ کے رسول...
تو آپ نے فوراً ٹوکا: کہ نہیں یوں کہو، آپ کے نبی
جن کو آپ نے رسول بنایا ہے۔“

یہاں دیکھیے کہ ہمارے لیے یہ بات شاید اتنی اہمیت کی حامل نہ ہو، ہمارا کوئی ساتھی اگر یہ جملہ یوں بھی کہتا کہ
’و رسولك الذي أرسلت‘، تو ہم کہتے چلوٹھیک ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن نبی آخر الزماں کی بصیرت رسالت
اس بات کو ایسے ہی نہیں جانے دینا چاہتی، اس لیے کہ اس سے دین کی دو بنیادی اور اہم اصطلاحات میں خرابی
آ جاتی۔ قرآن مجید میں نبی اور رسول دو الگ الگ منصب ہیں۔ یہ تو ہے کہ انسانوں میں سے ہر رسول نبی لازماً ہوتا
ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان میں سے ہر نبی لازماً رسول ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں منصب حاصل تھے۔
یہی وجہ ہے کہ صرف خاتم النبیین کہنے سے انسانوں میں نبوت و رسالت، دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر خاتم المرسلین
کہا جاتا تو نبوت کا اجرا قائم رہتا، کیونکہ نبوت بنیادی منصب ہے، اور رسالت اس کی بنیاد پر ملنے والا اعلیٰ منصب
ہے۔ اس فرق کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ کسی شخص کو وزارت عظمیٰ پانے کے لیے پارلیمنٹ کا ممبر ہونا ضروری ہے،

(نوٹ: آیت میں یہاں بھی ”سوائے اس کی ذات کے“ کے بجائے ”سوائے اس کے چہرے“ کے آیا ہے۔)

لیکن ہر پارلیمانی ممبر کے لیے وزیرِ اعظم ہونا لازم نہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ نبوت و رسالت کا ہے۔ جب تک کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے، اسے رسالت کا منصب نہیں مل سکتا۔ اس روشنی میں آپ اس جملے کہ ”نبی جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے“ کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اب اگر وہ جملہ بولا جائے جو میں نے قیاساً لکھا ہے کہ جو غالباً حضرت براء رضی اللہ عنہ کہنا چاہتے تھے، تو وہ اس تصورِ نبوت کے برعکس ہو جاتا ہے۔ اس تصور کو قرآن مجید میں بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف کی ذیل کی آیت میں دیکھیے کہ منصوبوں کو کس طرح ترتیبِ نزولی سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے سہولت کے لیے الفاظ کو خط کشیدہ کر دیا ہے:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ
جَمِیْعًا الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحِیْ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ
وَرَسُوْلُہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ
وَکَلِمَتِہٖ وَاَتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ۔
”ان سے کہو، اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا
رسول بنایا گیا ہوں، اس خدا کا رسول جو زمین و آسمان کا
بادشاہ ہے، جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، جو زندگی
اور موت دیتا ہے، لہذا اللہ کو مانو، اور اس کے اس رسول
کو مانو، جو امیوں میں سے نبی ہے، جو بذاتِ خود بھی اللہ
اور اس کے کلام کو مانتا ہے، اس کی پیروی کرو تو ہدایت
(۱۵۸:۶)

پاؤ گے۔“

یہ مثال میں نے اس لیے پیش کی کہ لفظی روایت کرنے سے بصیرتِ رسالت کے چنے ہوئے الفاظ ہم تک منتقل ہوتے ہیں، جن میں نہایت باریک اور دقیق پہلوؤں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہوتا ہے، جیسا کہ اس مثال میں ہم نے دیکھا۔ لیکن ذہین سے ذہین امتی، بڑے سے بڑا امام، اس بصیرتِ رسالت سے محروم ہوتا ہے، اس لیے وہ جب کلامِ نبوی کو بالمعنی روایت کرے گا تو اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس بصیرت سے بات کو آگے منتقل کرے کہ اس میں معمولی سا تغیر بھی نہ آیا ہو۔ اس مثال میں براء جیسے جلیل القدر صحابی ہیں، وہ کم عمر ہونے کی وجہ سے اس نازک بات کا فرق ملحوظ نہیں رکھ سکے، جس پر نبی رحمت نے ان کی اصلاح کی۔ شاید یہی وہ پہلو تھا کہ جس کی وجہ سے قدیم احناف راوی کے فقیہ ہونے کی شرط بھی لگاتے تھے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ صاحبِ نبوت کا وہ ملکہ اور علم جنہیں قرآن مجید نے ”الْکِتٰب“، ”الْحُکْم“ اور ”النُّبُوۃ“ کہا ہے، وہ فقیہ سے فقیہ راوی کے پاس بھی نہیں ہو سکتے۔

۳۶ مثلاً اس آیت میں دیکھیے، نبیوں کے ذکر کے بعد فرمایا:

اَوَلٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَتٰیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوۃَ فَاِنْ یَّکْفُرْ بِہَا هَؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِہَا قَوْمًا لَّیْسُوْا
بِہَا بِکٰفِرِیْنَ۔ (الانعام: ۸۹)

عصر حاضر میں جو حملہ حدیث پر ہوا ہے، اس کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان فقیہ اور غیر فقیہ راویوں نے روایت بالمعنی کے طریقے پر جب بات کو اپنے الفاظ میں منتقل کیا، اور مثلاً 'نبی' کی جگہ 'رسول' کا لفظ بول دیا ہوگا، جس سے معنی میں کہیں معمولی، کہیں بڑا اور کہیں غیر معمولی فرق آ گیا ہوگا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ذخیرہ حدیث کو متساہل طریقے سے اختیار نہ کریں، بلکہ نہایت دقت نظر سے تمام ذخیرہ حدیث کو پرکھیں اور کوشش کریں کہ لفظی اور معنوی اور اجات سے جس قدر ممکن ہو حدیث کو پاک کر لیں۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جہان فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد اب کون اس کے بارے میں بتا سکے گا کہ راویوں نے الفاظ بدل کر مضمون میں کیا کیا تبدیلیاں کر دی ہیں۔ اب ہمارے پاس اس عمل کے لیے خود قرآن مجید، سنت متواترہ اور متعدد طرق حدیث ہی کی روشنی میسر ہے۔ اس لیے نہایت دقت نظر سے کام کی ضرورت ہوگی۔

راے کا ادراج

اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی صحابی یا راوی کا فتویٰ یا راے حدیث کا حصہ بن گئی ہو۔ اس کی ایک عمدہ مثال وہ حدیث ہے جس میں عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسن بڑھانے کے لیے اگر ایسے کام کیے جائیں جو خلق اللہ میں تبدیلی کرتے ہوں تو ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے (بخاری، مسلم)۔ وہ حدیث یہ ہے:

عن عبد الله قال: لعن الله الواشمات والمتوشمات والمتنصصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله - فبلغ ذلك امرأة من بني أسد يقال لها أم يعقوب، فجاءت فقالت: إنه بلغني أنك لعنت كيت وكيت، فقال: وما لي لا ألعن من لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن هو في كتاب الله، فقالت: لقد قرأت ما بين اللوحين فما وجدت فيه ما تقول، قال: لئن كنت قرأته لقد وجدته، أما قرأت:

”حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حسن و تزئین کے لیے جلد پر نقش بنانے، اور بنوانے والیوں پر، چہرے کے بال اکھڑوانے والیوں، دانتوں کو رگڑ کر ان کا باہمی فاصلہ بڑھانے والیوں، اور یوں خلق اللہ کو تبدیل کرنے والیوں پر لعنت کی ہے۔ ان کی یہ بات بنو اسد قبیلہ کی ایک خاتون، جنھیں ام یعقوب کہا جاتا تھا، نے سنی تو وہ ان کے پاس آئی اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کچھ اس طرح کے لوگوں پر لعنت کرتے ہیں! انھوں نے کہا کہ میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی، اور جن کا ذکر

”وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا“؟ قالت: بلی، قال: فإنه قد نهى عنه. (بخاری، رقم ۴۶۰۴)

قرآن مجید میں بھی ہو۔ اس عورت نے کہا کہ میں نے تو قرآن مجید شروع سے آخر تک پڑھا ہے۔ لیکن میں نے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جو آپ کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا: اگر آپ نے صحیح طرح سے قرآن پڑھا ہوتا تو یقیناً یہ بات آپ اس میں پا لیتیں۔ کیا آپ نے یہ نہیں پڑھا کہ ”جو کچھ اللہ کے رسول نے دیا ہے، وہ لے لو، اور جس سے آپ نے روکا ہے، اس سے رک جاؤ“؟ اس عورت نے کہا: ہاں، میں نے یہ آیت پڑھی ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ پھر جان لو کہ ان کاموں سے نبی اکرم نے روکا ہے۔“

اس میں بیان کردہ تین نکات ہیں:

- ۱۔ اللہ تعالیٰ نے ان خواتین پر لعنت کی ہے جو ”واشمات“، ”متوشمات“، ”متنمصات“ اور ”متفلجات“ ہیں۔
- ۲۔ یہ لعنت زیب وزینت (makeup) کے لیے ایسا کرنے والیوں پر ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے ”للحسن“ کے الفاظ بولے ہیں۔

۳۔ ایسی زیب وزینت لعنت کی مستحق ہے جو خلق اللہ میں تبدیلی پیدا کرے۔

دوسرا اور تیسرا نکتہ سراسر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اپنی رائے ہے، اس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلا نکتہ جزو انبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہو سکتا ہے، لیکن جس محل میں یہ آیا ہے، اس محل میں یہ حضرت ابن مسعود کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ اسی طرح ملعونین کی فہرست میں بھی انھوں نے اضافہ کیا ہے۔ دیگر صحابہ سے صرف ”وشم“ اور ”وصال الشعر“ سے متعلق بیان لعنت روایت ہوا ہے۔ ”تنمص“ اور ”تفلج“ کے بارے میں نہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی اس روایت کے اگر تمام طرق اکٹھے کیے جائیں تو ان کی رائے کچھ یوں تشکیل پاتی ہے: بالوں میں مصنوعی بال لگانا، اور جلد پر نقش بنوانا، دونوں ایسے عمل نہیں ہیں کہ قرآن و سنت پر نظر رکھنے والا، ان کو ایسا جرم سمجھے جس پر اللہ تعالیٰ خود لعنت کر رہے ہوں، اس لیے کہ قرآن اور سنت دینی اور اخلاقی چیزوں پر زور دیتے ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اتنا سنگین جرم کیوں ہیں؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرآن و سنت پر غور کر کے اس کی سنگینی کا سبب از خود متعین کیا۔ یہ سبب ظاہر ہے ان کے اپنے اجتہادی فہم پر مبنی تھا۔ اس جرم کو انھوں نے ایسی چیز

سے جوڑا جو واقعی اس لعنت کی مستحق ہو۔ قرآن مجید میں انھیں ایک ملتی جلتی چیز ملی۔ وہ جانوروں کے کان وغیرہ کاٹنے سے متعلق تھی:

وَلَا ضَلَّٰلَتُهُمْ وَلَا مَنِيْنُهُمْ وَلَا مُرْنُهُمْ فَلْيَبْتَكَنْ اِذَا نَ الْاَنْعَامَ وَلَا مُرْنُهُمْ فَلْيَغْيِرَنَّ خَلْقَ اللّٰهِ
وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرًا مُّبِيْنًا. (النساء: ۱۱۹)

جانوروں کے کان کاٹنا، جسم پر نقش بنانے جیسا ہی ایک کام ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک جانور کے کان میں محض ایک کٹ لگا دینا اتنا برا کیوں ہے؟ قرآن کی اسی آیت میں اس کی علت بھی بتائی گئی ہے اور وہ خلق اللہ میں تبدیلی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ظاہری معنی میں لیا، یعنی جسم میں کوئی ظاہری تغیر خلق اللہ میں تبدیلی ہے۔ جیسے یہاں کانوں کو چھیدنا یا چیرنا بیان ہوا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے 'خسران مبین' کا باعث بتایا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے عبد اللہ ابن مسعود نے اسی حکم کا انطباق 'وشم' اور 'وصال الشعر' والی نہی پر بھی کر دیا۔ یہی نہیں، بلکہ اس سے ملتی جلتی چیزوں کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ ظاہری معنی میں جو جو کام خلق اللہ میں تبدیلی کا باعث تھے، وہ سب انھوں نے اس حکم کے تحت جمع کر دیے۔ لہذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'وشم' اور 'وصال شعر' سے روکا تھا تو انھوں نے 'تنمص' اور 'تفلج' کو بھی ایسا ہی عمل قرار دے دیا۔ یہ غور و فکر کا ایک عمدہ منہج ہے، جس سے فہم دین کے دروازے وا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سے سمجھی جانے والی بات قول رسول نہیں بنتی۔ مگر ہمارے ہاں اسے قول رسول سمجھا گیا ہے۔ کسی اور صحابی نے 'وشم' اور 'وصال شعر' کی روایت بیان کرتے وقت یہ سب کچھ نہیں بتایا۔ پورا ذخیرہ احادیث اس سے خالی ہے کہ حضرت ابن مسعود کے سوا کسی نے 'وشم' اور 'وصال شعر' کو خلق اللہ میں تبدیلی کے تحت بیان کیا ہو، اور زیبا لیش کے لیے ایسا کرنے والوں پر اس طرح سے لعنت بھیجی ہو۔

اس روایت کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ یہ ان کی رائے ہے۔ بنو اسد کے قبیلے کی خاتون نے یہ سوال نہیں کیا کہ آپ حدیث سنار ہے ہیں تو یہ آپ نے کہاں سے لی ہے۔ اس کا سوال یہ تھا کہ آپ ان لوگوں پر لعنت کیوں کر رہے ہیں؟ اس سوال سے صاف مترشح ہے کہ وہ اس رائے کو حدیث کے طور پر نہیں، بلکہ ابن مسعود کی رائے کے طور پر لے رہی تھی، اور عبد اللہ ابن مسعود نے جو جواب دیا، وہ بھی یہی بتا رہا ہے کہ وہ اپنی رائے ہی کا دفاع کر رہے ہیں۔ نہ وہ قول رسول سنار ہے ہیں اور نہ کسی قول رسول کا دفاع کر رہے ہیں۔

جب بنو اسد کی عورت نے ان سے پوچھا تو انھوں نے یہ کہنے کے بجائے کہ یہ میری رائے نہیں ہے میں آپ کو حدیث نبوی سنار ہا ہوں۔ انھوں نے اپنی رائے کا دفاع کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن

پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی، اور جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ ان کے جملہ کا ابتدائی حصہ کہ میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں بتا رہا ہے کہ لعنت کرنے کا عمل ان کا اپنا ہے۔ ورنہ سیدھا جواب یہ تھا کہ میں تو حدیث نبوی سن رہا ہوں، خود میں نے تو کسی پر لعنت نہیں کی۔ ان کے مروی جملے سے باول وبلہ دوسرا تاثر ہو سکتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ حدیث کی حکایت کرنے کے بجائے اپنی رائے کے حق میں ایک مکمل علمی استدلال پیش کر رہے ہیں۔

ان کے جواب پر دوبارہ نظر ڈالیں: انھوں نے کہا کہ میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی، اور جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ اس کا خط کشیدہ حصہ یہ بتا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے استدلال کر رہے ہیں، لیکن براہ راست حدیث پیش نہیں کر رہے تھے۔ ان کا اسلوب استدلال کا اسلوب ہے، روایت حدیث کا نہیں۔ ان کو بس کہنا چاہیے تھا، مجھے دوش نہ دو، میں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ان لوگوں پر لعنت کرتے سنا ہے وغیرہ۔ ان کا منشا یہ ہے کہ میری اس رائے کہ یہ اور یہ لوگ عند اللہ ملعون ہیں، کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر ہے۔

ان کے جملے کو ایک دفعہ اور دیکھیں: انھوں نے کہا کہ میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی، اور جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ جملہ کا آخری خط کشیدہ حصہ دل چسپ ہے، یہ ترجمہ ہے ان کے الفاظ: 'وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللَّهِ' کا اس جملے میں 'مَنْ هُوَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کی بات کا مطلب یہ ہے کہ میں جن لوگوں پر لعنت کر رہا ہوں۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ لیکن حدیث کا تمام ذخیرہ ان کے جواب کا وہ حصہ نقل نہیں کرتا، جس میں وہ یہ بتائیں کہ قرآن میں ان کا ذکر کہاں ہے؟ کسی راوی نے ان کی بات کو سمجھے بغیر ایک غیر متعلق آیت روایت میں بیان کر دی ہے۔ یہاں تو وہ آیت آنی چاہیے تھی، جو ان ملعون لوگوں کا ذکر کرتی جو 'وَشَم' اور 'وصال الشعر' کے مجرم ہوں، کیونکہ ان کے جملے میں 'مَنْ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو انسانوں کے لیے بولا جاتا ہے، باتوں یا نظریات کے لیے نہیں، اور یہاں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں ہے کہ اسے مجازی معنی میں لیا جائے۔ اس سے تصرف جو روایات میں ہوتا ہے، وہ بھی آپ پر واضح ہو رہا ہوگا، کہ کس طرح الفاظ، آیات اور جملے کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔

اس روایت میں بیان کردہ آیت تو زیادہ سے زیادہ یہ بتا رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو ماننے کا حکم قرآن میں ہے۔ یہ آیت تو اس کو پیش کی جانی چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو۔ ویسے سچی بات ہے کہ یہ آیت یہ بھی نہیں بتاتی۔ اس کے لیے اس سے زیادہ صریح آیات قرآن مجید میں موجود ہیں، جو نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے اخذِ دین اور آپ کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں۔ لیکن بفرض محال یہ آیت یہ معنی دیتی بھی تو تب بھی پوری حدیث کے مضمون میں یہ آیت بے محل (misfit) ہے۔ انھوں نے یقیناً اس خاتون کو وہ آیت سنائی ہوگی جس میں خلق اللہ میں تبدیلی کرنے والوں کا ذکر ہوگا۔ وہی آیت جو ہم نے اوپر سورۃ النساء سے نقل کی ہے۔ بس اسی آیت میں خلق اللہ میں تبدیلی کرنے والوں کا ذکر ہے۔ لیکن راویوں سے یہ آیت فراموش ہو گئی۔ کسی راوی نے اپنی طرف سے اس آیت کا یہاں پیوند لگا دیا۔ بعد میں یہ آیت موضوع سے متعلق نہ ہونے کے باوجود ماخذِ دین پر استدلال کے لیے پیش کی جانے لگی۔ بہر حال زیر بحث موضوع سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ عبد اللہ بن مسعود کی بات یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان لوگوں کو برا کہا ہے اور قرآن مجید نے بھی، اس لیے میں ان کو برا کہہ رہا ہوں، نہ کہ وہ قولِ رسول کی شرعی حیثیت منوانا چاہ رہے تھے۔

اس اور راج راے سے آپ یہ جان سکتے ہیں کہ ایک بات مستقل طور پر دین و شریعت کا حکم بن گئی کہ سوائے چند تبدیلیوں کے جن میں سر کی حجامت، مونچھوں کی تراش اور ڈاڑھی کا خط و غیرہ شامل ہیں کے سوا، اب جسم انسانی پر ہر طرح کی تبدیلی حرام ہوگی اور وہ حرمت بھی کبیرہ گناہ کے برابر ہے، اس لیے کہ ان اعمال پر لعنت کی گئی ہے۔ جو قرآنی پس منظر میں شرک اور قرآن اور رسول کے انکار جیسے جرائم پر کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک امتی کی راے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ درج ذیل روایت پر نگاہ ڈالیں۔ اس میں 'وشم' کرنے والیوں کے بارے میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہ الفاظ نقل کر رہے ہیں، جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہے۔ اس حدیث میں لعنت اور خلق اللہ میں تبدیلی کا ذکر نہیں ہے۔ اگرچہ اس روایت میں بھی تصرف کا پورا امکان ہے، مگر پھر بھی کسی قدر یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت عمر جیسے آدمی کے پوچھنے پر انھوں نے وہی بات کہی ہے جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہوگی:

عن أبي هريرة قال: أتني عمرُ بامرأةٍ تشتمُ، فقَام فقال: أَنشدُكُم بِاللَّهِ مَنْ سَمِعَ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْوَشْمِ، فقال أبو هريرة: فَقُتِلْتُ فَقُلْتُ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، أَنَا سَمِعْتُ، قال: مَا سَمِعْتُ؟ قال: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "لَا تَشْتُمَنَّ وَلَا تَسْتَوْشَمَنَّ". (صحیح بخاری، رقم ۵۶۰۲)

”ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا، جو جلد پر نقش بناتی تھی، تو آپ اٹھے اور کہا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کون ہے جس نے 'وشم' کے بارے میں آپ کو کچھ فرماتے ہوئے سنا ہو؟ ابو ہریرہ نے کہا کہ میں کھڑا ہوا اور بولا کہ اے امیر المؤمنین، میں نے سنا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: تم نے کیا سنا تھا؟ ابو ہریرہ نے کہا: میں نے نبی پاک کو کہتے

سنا تھا، آپ فرما رہے تھے: نہ نقش چلد پر بناؤ نہ بنواؤ۔“
اسے ہم نے اصل روایت اس لیے قرار دیا ہے کہ اس میں سیدنا عمر کے مطالبہ پر سیدنا ابو ہریرہ نے وہی الفاظ بتائے ہیں جو انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے تھے۔ چنانچہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ صرف یہ ہیں کہ: لَا تَشْتَمَنَّ وَلَا تَسْتَوْشِمَنَّ (نہ tattoo بناؤ اور نہ بنواؤ)۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی لعنت والی روایت نقل ہوئی ہے:
عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: ”لَعَنَ اللَّهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ، وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ.“ (بخاری، رقم ۷۲۳)
تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابو ہریرہ نے یہ بات حضرت عمر سے کیوں نہیں کہی؟ لگتا یہی ہے کہ بعد کے راویوں نے عبد اللہ ابن مسعود کے اثر میں یہ روایت میں تبدیلی کی ہے۔ اسی طرح سیدہ اسماء وعائشہ رضی اللہ عنہما سے بھی لعنت والی روایات نقل ہوئی ہیں:

عن أسماء بنت أبي بكر قالت: جاءني رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، إن لي ابنة عرساً أصابته حصبة فتمرق شعرها أفأصله؟ فقال: ”لعن الله الواصلة“. (مسلم، رقم ۲۱۲۲)
”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت امراۃ إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله، إن لي ابنة عرساً أصابته حصبة فتمرق شعرها أفأصله؟ فقال: ”لعن الله الواصلة“۔ (مسلم، رقم ۲۱۲۲)
بجی اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئی، تو اس نے پوچھا کہ اے رسول اللہ، میری بیٹی کی شادی ہے، لیکن اسے حصبہ کی بیماری ہوئی اور اس کے بال گر گئے ہیں، تو کیا میں مصنوعی بال اسے لگا دوں؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے ایسا کرنے والی پر لعنت کی ہے۔“

بخاری میں سیدہ عائشہ سے ایک ملتی جلتی روایت یوں آئی ہے:

عن عائشة أن امرأة من الأنصار زوجت ابنتها فتمعط شعر رأسها، فجاءت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فذكرت ذلك له، فقالت: إن زوجها أمرني أن أصل في شعرها فقال: ”لا إنه قد لعن المواصلات“۔ (بخاری، رقم ۴۹۰۹)
”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انصار کی ایک عورت نے اپنی بیٹی کی شادی کی، تو کسی بیماری کی وجہ سے اس کے سر کے بال جھڑ گئے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی، اور یہ بات بتا کر بولی کہ میری بیٹی کے شوہر نے کہا ہے کہ میں اس کے بالوں میں دوسرے بال لگا دوں۔ آپ نے فرمایا: نہیں بال لگانے والیوں پر لعنت کی گئی ہے۔“

واقعہ اور آخری جملہ دونوں روایتوں میں مختلف ہو گئے ہیں۔ مسلم میں شوہر کا ذکر نہیں ہے شادی ابھی ہوئی ہے، اور بخاری میں شوہر کے مطالبے پر بال لگانے کا ذکر ہے اور شادی ہو چکی ہے۔ اسی طرح آخری جملہ کے الفاظ بھی بدل گئے ہیں، راویوں نے اپنے فہم کے مطابق ان میں تبدیلی کر دی ہے۔ سیدہ اسماء کی روایت سے یہ کبیرہ گناہ بنتا ہے اور سیدہ عائشہ کے الفاظ سے ایسا نہیں ہوگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی ایک روایت نقل ہوئی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: "لُعِنَتِ الْوَاصِلَةُ، وَالْمُسْتَوْصِلَةُ، وَالنَّامِصَةُ، وَالْمُتَنَمِّصَةُ، وَالْوَاشِمَةُ، وَالْمُسْتَوْشِمَةُ، مِنْ غَيْرِ دَاءٍ." (سنن ابی داؤد، رقم ۴۱۷۰)

دو روایتیں حضرت معاویہ سے یوں نقل ہوئی ہیں:

عَنْ مُعَاوِيَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "إِنَّمَا امْرَأَةٌ آذَحَلَتْ فِي شَعْرِهَا مِنْ شَعْرِ غَيْرِهَا، فَإِنَّمَا تُدْخِلُهُ زُورًا." (مسند احمد، رقم ۱۶۹۲۷)

عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ: قَدِمَ مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سَفْيَانَ الْمَدِينَةَ آخِرَ قَدَمَةٍ قَدِمَهَا فَخَطَبَنَا، فَأَخْرَجَ كُبَّةً مِنْ شَعْرِ فَقَالَ: مَا كُنْتُ إِذْنِي أَحَدًا يَفْعَلُ هَذَا غَيْرَ الْيَهُودِ، إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمَاهُ زُورًا، يَعْنِي الْوَصَالَ فِي الشَّعْرِ. (بخاری، رقم ۲۲۹۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اگرچہ بات اللہ تعالیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے نہیں کی گئی۔ لیکن اس سے مراد یقیناً یہی لی جاتی ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لعنت کی گئی ہے۔ اس روایت نے ایک اور اضافہ کر دیا ہے، وہ غیر داء کا اضافہ ہے، یعنی جس نے یہ کام بلا وجہ کیے، ان پر لعنت کی گئی ہے، بیماری کی وجہ سے کرنے والے پر لعنت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات مذکورہ بالا تمام روایات کے خلاف ہے: عبد اللہ بن مسعود صرف حسن کے لیے خلق اللہ میں تبدیلی پر لعنت کر رہے ہیں، سیدات اسماء اور عائشہ بیماری کے باوجود لعنت کا کہہ رہی ہیں۔ ابو ہریرہ مطلقاً ہر اس شخص پر لعنت کر رہے ہیں جو ایسا کرے، بیماری میں یا بیماری کے بغیر، لیکن ابن عباس فرماتے ہیں کہ بیماری کی وجہ سے ایسا کرنے والوں پر لعنت نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دواور پہلوؤں کا اضافہ کیا ہے اور صریح الفاظ میں ایک کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، وہ یہ کہ ایسا کرنا دھوکا (زور) ہے۔ دوسرا اضافہ ان کا اپنے علم کی بنا پر ہے اور یہ ہے کہ ایسا صرف یہود کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہود کا یہ عمل کسی دینی فتویٰ پر کیا جاتا ہو، تو اسے بدعت ہونے کی وجہ سے منع کیا گیا ہو۔ اس عمل پر لعنت بھی ہو سکتی ہے، اس لیے کہ افتراء علی اللہ بھی ایک اسی نوعیت کا جرم ہے، جس پر لعنت ہو سکتی ہے۔ بہر حال اوپر کی تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کا فرمان کیا تھا؟ وہ ہمیں مکمل الفاظ میں منتقل نہیں ہو سکا۔

حضرت معاویہ کی بات کسی حد تک اس ممانعت کو دینی معنی میں قابل فہم بنا دیتی ہے کہ جس نے دھوکا دینے کے لیے مصنوعی بال سر میں لگائے، وہ خدا سے سزا پائے گا۔ مثلاً یہ کہ کسی بچی کے رشتے کے وقت حقیقت چھپانے کے لیے مصنوعی بال لگا کر رشتہ دکھایا جائے اور دلہا والوں کو دھوکے میں رکھا جائے کہ اس کے سر پر بال موجود ہیں، حالاں کہ اس کے بال نہ ہوں تو یہ بلاشبہ گناہ کی بات ہے اور اس پر لعنت ملامت کی جاتی ہے۔ لیکن یہ علت باقی لعنت کیے گئے اعمال میں کام نہیں آتی۔ اگر ان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی لعنت کی ہے تو اس کی دینی معنی میں وجہیں بس دو ہی سمجھ میں آتی ہیں: ایک یہ کہ عرب ان حرکات کو دین کا حکم سمجھ کر کرتے ہوں، اور دوسرے یہ کہ یہ مشرکانہ رسومات ہوں، تاریخی طور پر اس کے شواہد بھی موجود ہیں۔ یہ لعنت غیر دینی معنی میں بھی ہو سکتی ہے۔ اسے ہم تہذیبی معنی میں ناگوار کے مفہوم میں لے سکتے ہیں۔ لیکن زیبا لیش سے خلق اللہ میں تبدیلی والی بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے۔ وہ محض ایک بلند مرتبہ امتی کا فقہی فتویٰ ہے، جس کی مناط و علت کو ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے۔ جس کا اطمینان ہو، وہ اس پر عمل پیرا رہے، لیکن بطور نبی اکرم کے حکم کے نہیں، بلکہ صرف ایک امتی کے فتوے کی حیثیت سے۔

دو ضمنی حاشیے

قرآن مجید میں خلق اللہ کے معنی

تین مقامات پر خلق اللہ کا مرکب اضافی قرآن مجید میں آیا ہے۔ سورہ لقمان میں ہے:

خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَالْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ. هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ. (۱۱-۱۰:۳۱)

سورہ روم میں ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ. (۳۰:۳۰)

اور سورہ نساء میں یوں ہے، یہی آیت سیدنا ابن مسعود کے پیش نظر ہے:

وَلَا ضَلَالَتَهُمْ وَلَا مَنِيْنَهُمْ وَلَا مَرْنَهُمْ فَلْيَتَكُنْ اِذَا الْاَنْعَامُ وَلَا مَرْنَهُمْ فَلْيَغْيِرْ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرًا مُّبِيْنًا. (۱۱۹:۴)

ان تینوں مقامات پر خلق اللہ میں خلق کی اضافت اللہ کی طرف ہوئی۔ یہ اضافت نسبت و ملکیت کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس آیت میں خلق اللہ میں مصدر کی فاعل کی طرف اضافت ہوئی ہے، یعنی تخلیق کرنے والا اللہ ہے۔ یعنی جیسے کوئی مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کو یہ کہے کہ ”یہ میری خلق (تخلیق)“ ہے۔ اگر کوئی اور یہ دعویٰ کر دے کہ تصویر تو میں نے بنائی ہے تو اس کو کہا جائے گا کہ یہ خلق اللہ میں تبدیلی ہے۔ یعنی عمل خلق اور خالق میں نسبت کی تبدیلی ہے۔ قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اسی نسبت خلق کی وجہ سے الہ یارب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے خالق نہ ہوتے تو وہ اپنے آپ کو ہمارا الہ و رب نہ کہتے۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رب ہونے کی دو دلیل دی ہیں:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلٰى الْعَرْشِ يُغْشِى الْاَيْلَ النَّهَارِ يَطْلُبُهُ حَبِيْنًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ. (۵۴:۷)

”پچھ شک نہیں کہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر بیٹھا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے۔ اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں کو پیدا کیا سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے)۔ یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔“

ان تینوں مقامات پر خلق ظاہری ڈھانچے اور شکل و صورت کے معنی میں مستعمل نہیں ہے۔ اس لیے یہ معنی لینا ہرگز ممکن نہیں کہ خلق اللہ میں تبدیلی کا مطلب ظاہری صورت میں تبدیلی ہے۔ اب ہم وہ آیت دیکھتے ہیں جس میں خلق اللہ کی تبدیلی کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے:

لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَا تَتَّخِذْ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا ”جس پر اللہ نے لعنت کی ہے، (وہ اللہ سے) کہنے

۳۷ اس آیت مبارکہ میں لف و نشر مرتب ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، اور اسْتَوٰى عَلٰى الْعَرْشِ کے مقابل میں اَلَا لَهُ الْخَلْقُ، اور اَلَا لَهُ الْاَمْرُ بالترتیب انداز میں آئے ہیں۔

نقطہ نظر

مَفْرُوضًا. وَلَا ضِلَّيْنَهُمْ وَلَا مَنِيْنَهُمْ وَلَا مَرْنَهُمْ فَلْيَبْتَئِكُنَّ أَذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَا مَرْنَهُمْ فَلْيَعْيِرَنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا.

لگا: میں تیرے بندوں سے (غیر اللہ کی نذر دلو کر مال کا) ایک مقرر حصہ لے لیا کروں گا۔ اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا اور یہ سکھاتا رہوں گا کہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں اور کہتا رہوں گا کہ وہ اللہ کی تخلیق کو بدلتے رہیں گے۔ — اور جس شخص (النساء: ۱۱۸-۱۱۹)

نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا اور وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔“

کسی دیوتا کے لیے جانور کی نیاز دینے کے لیے مشرکین عرب کا یہ طریقہ تھا کہ جانوروں کے کان کاٹ دیتے، یہ ایک نشانی ہوتی تھی کہ یہ جانور اب نیاز کا ہے، اسے کوئی نہ چھیڑتا تھا۔ اس آیت میں اسی رسم کی طرف اشارہ ہے۔ گویا جو کام اللہ کے لیے ہونا چاہیے تھا، وہ کام یہ لوگ جھوٹے دیوتاؤں کے لیے کرتے تھے۔ یہی عمل خلق اللہ میں تبدیلی ہے۔ یعنی جب ایک آدمی غیر اللہ کو نذر چڑھاتا ہے تو گویا وہ اپنے اس عمل سے یہ کہتا ہے کہ اس جانور کا خالق یہ دیوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر لعنت ہے۔ اس لیے کہ کسی جانور کی قربانی دینا یا بلی چڑھانا صرف اور صرف خالق حقیقی کا حق ہے۔ اسی کے کہنے پر جانور کی جان لینا جائز ہے، اور اسی کے آگے اس کی نذر اور نیاز پیش کی جاسکتی ہے۔ سو یہ واضح رہنا چاہیے کہ اللہ کے سوا خلق کی نسبت کسی اور ذات کی طرف کرنا یہ خلق اللہ میں تبدیلی ہے۔ سر اور ناک کے بال اور مونچھیں کاٹنا، ڈاڑھی کا خط بنانا، ناخن کاٹنا اور زیر ناف اور بغلوں کے بال کاٹنا، ناک اور کان چھدوانا، بازو وغیرہ پر گدوانا، وگ وغیرہ بالوں میں جوڑنا کسی دینی، دنیوی، طبعی، سماجی یا طبی ضرورت سے ایسا کرنا ہرگز خلق اللہ میں تبدیلی نہیں۔ لیکن صرف ایک بال بھی کسی دیوتا کی خوش نودی کے لیے، یا اس کی نسبت سے کاٹنا، لگانا یا رنگنا خلق اللہ میں تبدیلی ہے اور اس پر قرآن مجید میں لعنت کی گئی ہے۔ خلق اللہ میں تبدیلی خالق و مخلوق میں نسبت کی تبدیلی ہے۔ سورہ لقمان کی ذیل کی آیت میں خلق اللہ کی یہی وضاحت آئی ہے:

هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ. (۱۱:۳۱)۔

لعنت کے معنی

بعض صحابہ نے ان چیزوں کے لیے لُعِنَ، لَعَنَ اللّٰهُ، اور لَعَنَ النَّبِيَّ کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ یہ الفاظ

بلاشبہ بہت سخت معنی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں یہ زبان کے ایک محاورے کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جہاں اس کے معنی نہایت نرم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ”لسان العرب“ میں اس کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں:

لَعْنَةُ يَلْعَنُهُ لَعْنًا طَرْدُهُ وَأَبْعَدُهُ مِنَ الْخَيْرِ وَأَخْزَاهُ وَسَبَّهُ: لَعْنَهُ يَلْعَنُهُ لَعْنًا.

(اس نے اس کو دھتکارا، خیر سے محرومی کی بد عادی، اسے رسوا کرنے والی بات کہی یا اسے گالی دی)۔

تو جب یہ الفاظ لوگوں کے لیے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فاعل کی نسبت سے آئیں تو اس کا مطلب صرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کام کو معاشرتی، سماجی یا تہذیبی معنی میں پسند نہیں کیا گیا۔ حلت و حرمت کا اس میں دخل نہ ہو۔

اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بعض اوقات ایک چھوٹے کام کے لیے ’لعت‘ کا لفظ آ جائے گا۔ تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ لعنت اس عمل پر نہیں، بلکہ اس چیز پر کی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کام کیا جاتا ہے۔ جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ آپ نے اس آدمی پر لعنت کی جو لوگوں کے حلقہ کے درمیان میں بیٹھتا ہے۔^{۳۸} ظاہر ہے حلقہ کے بیچ میں بیٹھنا ممنوع چیز نہیں ہے، بلکہ یہ بڑائی اور تکبر ہوتا ہے جس کی وجہ سے کوئی آدمی یوں لوگوں میں نمایاں ہو کر بیٹھتا ہے۔ واضح ہے کہ اس میں خود نمائی کے شکار ہو کر آدمی پر لعنت کی گئی ہے، نہ کہ محض حلقہ کے وسط میں بیٹھنے والے پر۔ یہی معاملہ ٹخنوں سے تہ بند کے نیچے لٹکنے کا ہے۔ تہ بند کا لٹکنا گناہ نہیں، بلکہ تکبر سے ایسا کرنا گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حدیثوں میں ’خیلاء‘ کے الفاظ آئے ہیں کہ تکبر سے تہ بند لٹکانا اور بعض میں ’إسبال‘ کے الفاظ آئے ہیں، جس کے معنی ہی تکبر سے تہ بند لٹکانے کے ہیں وغیرہ۔ اسی معنی میں وہ جملہ ہے جو مصنوعی بال لگانے والی کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے: ’لعن اللہ الواصلة‘ (اللہ نے مصنوعی بال لگانے والی کو دھتکارا ہے)۔ اس کی وجہ بال لگانا نہیں، بلکہ دھوکا دینا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ دھوکے کا ذکر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ہوا ہے۔ اسی طرح اگر یہ اعمال مذہبی رسوم کی صورت اختیار کر چکے تھے تو اس صورت میں یہ بدعت اور افتراء علی اللہ کے زمرے میں آتے ہیں، جس پر قرآن میں وعید بہت سخت ہے، اس صورت میں لعنت اپنے سخت ترین مفہوم میں

۳۸ واضح رہے کہ یہ حدیث امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دی ہے، جبکہ البانی اور شیخ الارؤط نے ضعیف قرار دی ہے۔ (دیکھیے سنن الترمذی، رقم ۲۷۵۳)۔ میں نے یہاں محض لسانی استدلال کے لیے اقتباس کی ہے کہ ہم کس طرح ایسے مجازی اسالیب میں ایسے جملے بول لیتے ہیں۔ کسی شرعی حکم کے استنباط کے لیے نقل نہیں کی۔ بعض شارحین نے اس شخص پر لعنت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ مجلس میں گفتگو کے دوران میں دوسروں کو دیکھنے وغیرہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

نقطہ نظر

ہے۔ تیسرا امکان جیسا ہم نے عرض کیا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اعمال اگر دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے تھے، تو اس صورت میں شرک کا باعث تھے، اس لیے ان پر لعنت بھی اپنے سخت ترین مفہوم میں ہوگی۔
زیبائش کے لیے جو ایسا کرے، اس پر لعنت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب نہیں ہے۔ آپ نے شادی پر بال لگانے کے موقع پر جو لعنت کی ہے، اس میں وہی پہلو آتا ہے جو حضرت معاویہ نے واضح کر دیا ہے کہ وہ زور یا دھوکا ہے۔

اسی طرح اس بات کا پورا امکان ہے کہ دانت ترشوانے والیوں اور tattoo بنوانے والیوں پر لعنت محض کرہیت ذوقی کے معنی میں ہو، یعنی اچھے نفس الطبع لوگ ایسے عمل پسند نہیں کرتے۔ ہم نے یہ سارے امکانات رکھ دیے ہیں، اس لیے کہ احادیث کے یہ متون حتمی طور پر صرف مصنوعی بال لگانے والیوں پر لعنت کی وجہ زور یا دھوکا بتاتے ہیں۔ باقی اعمال کی لعنت کا سبب روایات سے واضح نہیں ہوتا۔ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خلق اللہ میں تبدیلی کی علت کی تخریج کی تھی۔

[باقی]

